فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۱۰۱

از جنوری ۱۹۶۸ء تا جون ۱۹۶۸ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شعراء

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۰۱

از جنوری ۱۹۶۸ء تا جون ۱۹۶۸ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۰۱ ماہ شوال المکرم ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۶۸ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

گذشتہ رمضان میں قرآن مجید کے نزول پر ۱۴ سو سال پورے ہو گئے، اس تقریب میں دنیائے اسلام میں اس کی چودہ سو سالہ یادگار منائی جا رہی ہے، اس قسم کی یادگاریں عام طور سے رسمی ہوتی ہیں، کوشش اس کی ہونی چاہیے کہ ان سے مستقل فائدہ اٹھایا جا سکے، اس کا صحیح اور موثر طریقہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی زندگی کو قرآنی احکام کے مطابق بنانے کی کوشش کریں، درس قرآن کے حلقے قائم کیے جائیں، قرآنی تعلیمات کو مختلف زبانوں میں شائع کیا جائے، قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھی جائیں، اس پر غیر مسلموں کے اعتراضات کا محققانہ جواب دیا جائے، لیکن سب سے بڑی یادگار یہی ہے کہ مسلمان اپنی زندگی سے قرآنی تعلیمات کا عملی نمونہ پیش کریں جس کو دیکھکر دوسری قومیں خود اس کی طرف کھنچیں، صحابۂ کرام اور دوسرے مبلغینِ اسلام نے کبھی کوئی یادگار نہیں منائی بلکہ اپنے عمل سے قرآن مجید کی عظمت کا سکہ بٹھایا، اور آج بھی اسلامی احکام کی تبلیغ کا سب سے صحیح طریقہ یہی ہے، تاہم اس قسم کی یادگاریں بھی فائدہ سے خالی نہیں ہیں، ان سے کم سے کم مسلمانوں کے دینی جذبہ کا اظہار ہوتا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ ان سے مستقل فائدہ کی شکل پیدا کی جائے۔

~~~~~~~~

مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا قرعۂ انتخاب ڈاکٹر عبد العلیم صاحب صدر شعبۂ عربی و اسلامیات کے نام نکلا، اس انتخاب کے متعلق متضاد رائیں ہوں گی مسلمانوں خصوصاً مسلم یونیورسٹی کا آزاد خیال طبقہ اس کو اپنے اثر و اقتدار کا دیباچہ اور مذہبی طبقہ اس کو یونیورسٹی کے لیے مضر سمجھے گا لیکن اس مسئلہ کو جذبات سے الگ ہو کر یونیورسٹی کے مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے، اب وائس چانسلر کا انتخاب مسلمانوں کی مرضی کے

معارف نمبر ا جلد ۱۰۱ ۳ شذرات

مطابق نہیں ہو سکتا، اس لیے جس شخص سے یونیورسٹی کی ہوا خواہی اور اس کی صحیح خدمت کی نسبتۃً زیادہ توقع ہو، اس کو غنیمت سمجھنا چاہیے، اس حیثیت سے ڈاکٹر علیم صاحب کا انتخاب بہت غنیمت ہے۔

~~~~~~~~

وہ اگرچہ کمیونسٹ ہیں لیکن دیانتدار، با اصول اور صاحب کردار ہیں کسی غرض و مصلحت کے لیے کسی اصول کو قربان نہیں کر سکتے، ان کی کمیونزم ان کی ذات اور ان کے حلقہ تک محدود ہے، خود ان کا گھر مذہبی ہے، اور وہ اس میں کوئی مزاحمت نہیں کرتے بلکہ مدد دیتے ہیں، مذہب کا ظاہری احترام قائم رکھتے ہیں، اپنے ڈپارٹمنٹ میں انھوں نے مذہبی اور غیر مذہبی اور کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا، سب کے ساتھ انصاف برتا، اسلامی اور مذہبی موضوعوں پر اپنی نگرانی میں جو مقالے لکھوائے اُن میں بھی اپنے خیالات کو اثر انداز نہیں ہونے دیا، اس لیے یونیورسٹی کے معاملات میں بھی ان سے اسی دیانتداری کی توقع رکھنی چاہیے، اور ہم کو امید ہے کہ وہ یونیورسٹی کو اسکے نصب العین کے مطابق چلانے اور اس کے کردار اور خصوصیات کو قائم رکھنے کی کوشش کرینگے لیکن موجودہ مخالف حالات میں کوئی ایسی توقع قائم نہ کرنا چاہیے جس کا پورا کرنا ان کے بس میں نہ ہو، یونیورسٹی ان کو جس حالت میں ملی ہے اس کو سدھارنا بہت دشوار ہے، اس لیے دیکھنا صرف یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا دور اُن کے "نیکنام" پیشرو کے مقابلہ میں یونیورسٹی کے لیے کہاں تک مفید ثابت ہوتا ہے۔

~~~~~~~~

ڈاکٹر علیم صاحب علی گڑھ کے پرانے طالب علم ہیں، پھر شعبۂ عربی و اسلامیات کے لکچرار اور صدر کی حیثیت سے برسوں سے یونیورسٹی سے ان کا تعلق ہے، وہ اپنی انتظامی قابلیت کی بنا پر انتظامی امور میں بھی دخیل رہے، اس لیے یونیورسٹی کے پورے مزاج شناس اور اس کی سیاست و نشیب و فراز سے پوری طرح واقف ہیں، اس لیے مختلف حیثیتوں سے ان کا انتخاب نہایت موزوں ہے،
~~~~~~~~

اور ان سے یونیورسٹی کی بھلائی ہی کی توقع رکھنی چاہیے، ہم کو امید ہے کہ ہمارا حسن ظن صحیح ثابت ہوگا، اور اگر ہماری توقع پوری نہ ہوئی تو ہمارا حقِ تنقید محفوظ ہے۔

ہندی کے نادان دوستوں نے جس بھونڈے طریقے سے انگریزی کے خلاف تحریک چلائی ہے، اور جیسی جیسی مضحکہ انگیز حرکتیں کی ہیں اس کے نتائج ان کی نگاہوں کے سامنے آرہے ہیں، اگر اب بھی ان کو ہوش نہ آیا تو ہندی نہ صرف غیر ہندی ریاستوں میں گھسنے نہ پائیگی، بلکہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، طلبہ کو بھڑکا دینا آسان ہے لیکن پھر ان کو قابو میں رکھنا بہت دشوار ہے، اگر سیاسی پارٹیاں انکو اسی طرح آلۂ کار بناتی رہیں تو ہندوستان کا بھی وہی حشر ہوگا جو انڈونیشیا کا ہوا ہے، لیکن اقتدار کی ہوس میں ملک کی فکر کس کو ہے۔ ان کو تو حکومت ملنی چاہیے، ملک کا جو حشر بھی ہو، زبان کا مسئلہ بڑا سخت ہے، اس سے ہندی کے نادان دوستوں کو پورا سبق مل جائے گا، انھوں نے شمالی ہند کی زبانوں کو جس طرح دبایا ہے جنوبی ہند میں اس کا پورا بدلہ مل رہا ہے، جمہوریت دو دھاری تلوار ہے، اگر آزمودہ کار ہاتھوں میں ہو تو ملک کی بہترین محافظ و خدمت گذار ہے، ورنہ انتشار و بدنظمی کی نقیب، جس کا مشاہدہ ہندوستان میں ہو رہا ہے، پاکستان کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

ابھی مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا غم تازہ تھا کہ ایک اور بزرگ ہستی کا سایہ اٹھ گیا، رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ بلیاوی صدر مدرس دار العلوم دیوبند نے وفات پائی، مرحوم اس دور کے نامور عالم دین اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے، تقریباً نصف صدی تک دینی علوم کے درس کی خدمت انجام دی اور ان کے چشمۂ فیض سے ہزاروں تشنگان علم سیراب ہوئے، ان کی وفات سے علم و عمل، درس و تدریس اور تدین و تقویٰ کی ایک بڑی یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے۔

مقالات

حیاتِ سلیمانی کا ایک صفحہ

(وفد خلافت کی روداد سید صاحبؒ کے قلم سے)

پہلی جنگ عظیم میں ترکوں نے اتحادیوں کے مقابلہ میں جرمنی کا ساتھ دیا تھا، اس لیے دورانِ جنگ ہی میں اتحادیوں نے شریف حسین کو عراق سے لیکر شام و فلسطین تک کی متحدہ عربی حکومت کے قیام اس کی حکمرانی کا خواب دکھا کر عربوں کے خلاف کھڑا کر دیا اور یہ پورا علاقہ ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا، جرمنی کی شکست کے بعد جو ترکی کی بھی شکست تھی، اتحادی خالص ترکی علاقوں کو بھی مال غنیمت کے طور پر تقسیم کر کے ترکی حکومت کو بالکل ختم کر دینا چاہتے تھے، اور صرف ایک چھوٹے سے حصہ میں اپنی نگرانی میں نام کے لیے اس کا نشان باقی رکھنا چاہتے تھے، اس لیے پوری اسلامی دنیا میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی تھی، انھوں نے اس کے خلاف متحدہ آواز بلند کی، ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی جزیرۃ العرب کے تحفظ اور ترکی حکومت کی بقاء کی کوشش کے لیے خلافت کمیٹی قائم کی، اس نے فروری ۱۹۲۰ء میں ان دونوں مسئلوں پر اتحادیوں سے گفتگو کے لیے مولانا محمد علی مرحوم کی قیادت میں ایک وفد روانہ کیا، اس کے ارکان حضرت سید صاحبؒ، سید حسین اور حسن محمد حیات تھے، لندن میں مقیم مشیر حسین قدوائی، شعیب قریشی اور عبد الرحمن صدیقی بھی وفد کے کاموں میں شریک ہو گئے تھے، یہ وفد کئی مہینہ تک لندن اور پیرس میں قیام کر کے کوشش کرتا رہا،

مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور اتحادیوں نے ترکی حکومت کی قسمت کا فیصلہ کردیا، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے کچھ حصے آزاد کردیے گئے، کچھ اتحادیوں کی حکم برداری میں دیدیے گئے، کچھ یونان کے حوالے کردیے گئے، قسطنطنیہ اور اس کے نواح میں اتحادیوں کی نگرانی میں نام کے لیے اس کا نشان باقی رکھا گیا، جس کا آگے چل کر مصطفی کمال کی تلوار نے فیصلہ کیا۔

حضرت سید صاحبؒ وفد کے کاموں کی رپورٹ برابر اپنے خطوط میں لکھتے رہتے تھے، وہ ایک محقق اور مفکر بھی تھے، اس لیے انھوں نے وفد کے کاموں کے ساتھ یورپ کی سیاست اور اس کی زندگی کے مختلف رخوں کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا تھا، اور ان کے متعلق ان خطوط میں نہایت دلچسپ اور مفید معلومات ہیں، یہ خطوط اس زمانہ کے اردو اخبارات میں چھپتے رہتے تھے، جن کے پڑھنے والے بھی اب بہت کم رہ گئے ہیں، کراچی کے قیام کے زمانہ میں سید صاحبؒ نے ان کا مجموعہ "برید فرنگ" کے نام سے شائع کیا تھا، جو ہندوستان میں کمیاب اور بہت کم لوگوں کی نظر سے گذرا ہے، راقم نے حیات سلیمانی میں وفد خلافت کی روداد ان خطوط کی روشنی میں لکھی ہے، ناظرین معارف کے لیے اس پارینہ مگر دلچسپ داستان کو شائع کیا جاتا ہے، اس سے وفد خلافت کے حالات کے علاوہ مختلف قسم کے مفید اور دلچسپ معلومات حاصل ہوں گے، یہ روداد حضرت سید صاحبؒ ہی کے قلم سے ہے، راقم نے اس کو صرف مرتب کردیا ہے۔

"م"

وفد خلافت مصوع میں: ہندوستان کی سرزمین کو خیرباد کہنے کے بعد وفد نے جس سرزمین پر قدم رکھا وہ مصوع ہے، جو اٹلی کے افریقی مقبوضہ ارتیریا کی بندرگاہ ہے، یہاں اثنائے سفر میں جہاز کچھ دیر کے لیے ٹھہرا تھا، اس کی آبادی خالص عرب ہے، اس لیے ارکان وفد نے اس کی سیر کی، سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

یہ پہلا موقع ہے کہ میرے پاؤں ہندوستان کے سوا اور کسی ملک میں ٹکے، اور ایک عرب گورنمنٹ کے اہتمام و انتظام کی ایک جھلک بھی نظر سے گذری، راہ میں ایک مسجد نظر آئی، نماز مغرب کے لیے وہاں گئے، نماز کے بعد لوگوں نے اجنبی سمجھ کر ہم لوگوں کی طرف دیکھا، السلام علیکم کے بعد ہمارے مقاصد سفر سے جب وہ مطلع ہوئے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کے چہروں سے کیسے شگفتگی کے آثار نمایاں تھے، فوراً سب نے ہماری کامیابی کے لیے دست دعا دراز کیے، بدحال حبشی عرب تھے، سیہ فام تھے، ژولیدہ مو تھے، لیکن ذوق چشیدہ ایمان تھے، ہماری آنکھیں قیامت تک ان کے چہروں کی شگفتگی، انکی دست بوسی اور ان کی بغلگیری کے جلووں کو نہیں بھلا سکتیں (برید فرنگ، مکتوب ۵)

مصوع میں ہندوستانی آبادی کو دیکھ کر تعجب ہوا، گجرات، کاٹھیاوار اور کچھ کے ہندو بنیے اور بوہرے، خوجے مسلمان یہاں تاجر ہیں، اردو کی فرمانروائی دیکھئے کہ افریقہ کے ریگستان تک پہنچ گئی ہے، اتفاقاً ہندوستانی بھائیوں سے ملاقات ہوگئی، انھوں نے اس قدر آؤ بھگت، خاطرداری اور مہمانداری کی کہ اظہار مشکل ہے، دوسرے جہاز سے لالہ لاجپت رائے اور مشیر حسین قدوائی اترے، خلافت کے متعلق باتیں ہوئیں، مشیر حسین نے حقیقت میں بڑا کام کیا، وہ کہتے تھے کہ سر آغا خاں کی کوششیں بھی شکریہ کے لائق ہیں، روسی آذربیجان میں اسلامی ریپبلک کا قیام اور حکومت انگریزی کا اس کو تسلیم کرنا انہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ (برید فرنگ، ۶)

وفد نے جہاز ہی سے اپنے مقاصد کی تبلیغ شروع کردی تھی، چنانچہ راستہ میں جہاں جہاں مسلمانوں کی آبادی ملی سب کو مقصد سفر سے آگاہ کیا، اور اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔

پورٹ سعید میں: ان مقامات میں جہاں ہم کو موقع ملا مسلمانوں سے ملے، ان کو ان کا فرض یاد دلایا اور اپنے کام سے آگاہ کیا، ہم نے ہر جگہ پایا کہ دلوں میں آگ سی لگی ہے، قاہرہ کا خیال تھا لیکن گاڑی کا مناسب وقت نہ مل سکا، مگر پورٹ سعید میں جو مصر کی آخری سرحد ہے اور جہاں سے یورپ کا

پہلا قدم شروع ہوتا ہے، صرف ایک شب بسر کی، جامع عباسی میں نماز مغرب پڑھی، یہ سنکر ہندوستانی مسلمانوں کو تعجب ہوگا کہ ایک ہی صف میں حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی نماز پڑھ رہے تھے، اور امام سب کی رعایت کر رہا تھا، اتفاق سے مسجد میں بعض اخبارات کے مضمون نگاروں سے ملاقات ہوگئی، اپنے وفد کے مقاصد ان سے بیان کیے، امام جامع نے ہمارا خیر مقدم کیا، نماز مغرب کے بعد وہاں کے ایک شیخ فقہ کا درس دینے بیٹھے جس میں فقہ شافعی کے مسائل انھوں نے بیان کیے، اکثر مقتدی جو جماعت میں شریک تھے، اس حلقہ میں شریک ہوئے، جن میں ہوٹلوں کے خانساماں اور ملازمین بھی تھے، شیخ درس کے بعد مجھ سے عربی میں باتیں کرتے رہے، میں نے بہ تفصیل اپنے مطالب جب ان کو بتائے تو تمام حلقۂ درس جوشِ مسرت سے لبریز ہوگیا، شیخ نے دعائے نصرت مانگی اور سب نے آمین کہی،

حلقہ سے اٹھ کر نماز عشاء پڑھی، پھر مسجد سے نکلے تو ہر جگہ ہمارا چرچا تھا، بازار میں ایک جگہ عربی اخبار خریدنے کو گاڑی روکی تو چاروں طرف اسقدر ہجوم ہوا اور اترنے اور قہوہ پینے کیلیے اسقدر اصرار ہوا کہ ہم کو خوف ہوا کہ کہیں میلہ سا نہ لگ جائے، مخالفین اسلام اور ظالمین ارض پر اس قدر علانیہ تبرا کیا گیا کہ قیاس میں نہیں آسکتا، ایک مصری نے جو اردو جانتا تھا، قریب آیا اور زور زور سے بدترین ہندوستانی گالی ان کے حق میں پوری قرأت کے ساتھ ادا کی، ہم سمجھے کہ مصر آجکل کوہ آتش فشاں ہو رہا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مجمع کوئی غضب آلود شکل اختیار کرلے، اس لیے بدقت تمام جان چھڑا کر ایک عرب ہوٹل میں گئے، وہاں مصری کھانا کھایا، حسن اتفاق سے ہوٹل میں سربرآوردہ رہنمایانِ شہر سے ملاقات ہوئی، دیر تک گفتگو رہی، مصر کے اخبارات میں شاید ہمارے متعلق حالات شائع ہوئے ہیں۔ (بریدِ فرنگ ص ۹، ۱۱)

وینس کا حال دوسرے دن ایک بجے کے قریب وینس آیا لیکن ساحل تک پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی، یہ شہر چھوٹے چھوٹے جزیروں کا ایک جال ہے، ہر جزیرے سے گذرتے ہوئے آخر اس

بڑے جزیرے کے قریب لنگر انداز ہوئے جو اصل شہر ہے، یہ بڑا جزیرہ بھی بیچ بیچ کی چھوٹی چھوٹی سیکڑوں نہروں پر منقسم ہے، جن کو جابجا پلوں کے ذریعہ باہم ایک کیا ہے، بجائے سڑکوں کے نہریں ہیں، ایک جگہ سے دوسری جگہ کشتیوں پر آتے جاتے ہیں، چنانچہ ہم ہوٹل کشتی پر گئے، اسٹیشن بھی کشتی پر گئے، تمام شہر یادگار تاریخی عمارتوں کا مرقع ہے، تمام راستے سنگی یعنی پتھروں سے بنے ہوئے ہیں، یہاں کا ہر پتھر تاریخ کا ایک صفحہ ہے، گویا دہلی مرحوم کا نقش مرقوم ہے، لیکن دہلی ویران و منہدم ہے اور یہ عمارت ابتک زندہ و قائم ہیں۔ (ص ۱۱)

کام کا آغاز یورپ کی سرزمین میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی ہمارے رفقا نے کام شروع کردیا، وینس کے ہوٹل میں جانے کے ساتھ جو اخبار ملا اس سے معلوم ہوا کہ لندن میں صلح ترکی کے لیے جلسے ہو رہے ہیں، کل کی گاڑی نہ مل سکی، اس لیے ٹھہرنا پڑا، لیکن دن بھی بیکار نہ گیا، اور کی شام کو وینس اترے اور کچھ کھا پی کر فوراً ڈاک خانہ اور تار گھر گئے اور تین بجے شب تک وہیں محمد علی اور سید حسین صاحبان نے بیٹھکر بہ تفصیل اپنے مطالبات کے تار وزیر ہند، وزیر اعظم لیبر پارٹی اور بڑے بڑے اخباروں کے نام بھیجے، اٹلی کے اخبارات کے نامہ نگار ملاقات کو آئے، ان سے اپنے مطالبات بیان کیے اور دوسرے دن اکثر اخبارات میں وہ شائع ہوگئے۔ (مکتوب ع م ص ۱۱)

فرانس کی روانگی ۲۳ کو فرانس روانہ ہوئے، ۲۵ کی صبح کو پیرس پہنچے، پہنچنے کے ساتھ ارکان وفد کو معلوم ہوا کہ کل ہی شب کو ہاؤس آف کامنس میں قسطنطنیہ پر مباحثہ ہونے والا ہے، اس لیے اسی وقت وزراء اور لیبر پارٹی کے لیڈر کو تار دیا اور پہلی ٹرین سے لندن روانہ ہوگئے۔

لندن میں ورود اور ہاؤس آف کامنس کے مباحثہ میں شرکت ۲۶ کی رات کو وفد لندن پہنچا، اور اسی وقت ہاؤس آف کامنس روانہ ہوگیا، معزز مہمانوں کی صف میں انکی نشست کا انتظام کردیا تھا، وزیر اعظم کی تقریر ہوچکی تھی، دوسرے ممبران تقریر کر رہے تھے، لیبر پارٹی کے بعض ممبران وفد کے

طرفدار تھے، وزراء اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ قسطنطنیہ ترکوں کے ہاتھ میں رہے، آخر میں مسٹر بونر لا نے ایک بسیط تقریر کی، اور معترضین کا جواب دیا، لیکن وزراء اور ممبروں میں سے جو بھی وفد کے موافق کہلاتے تھے، وہ صرف اپنی مصلحتوں کی بنا پر قسطنطنیہ ترکوں کے ہاتھ میں لفظاً رکھنا چاہتے تھے، حقیقی طور پر وہ بھی نہیں یعنی ترکوں کو قسطنطنیہ پر کوئی اختیار نہ ہوگا، تمام قلعے مسمار کر دیے جائیں گے، جہاز ڈبو دیے جائیں گے اور استحکامات منہدم کر دیے جائیں گے۔

ترکوں کے خلاف ارمنوں اور یونانیوں کا پروپیگنڈا

وفد کو سب سے بڑی دقت یہ پیش آرہی تھی کہ ارمنوں اور یونانیوں نے ترکوں کے خلاف پروپیگنڈے کا ایسا جال پھیلا دیا تھا کہ سارے یورپ اور امریکہ میں ان ہی کی آواز بازگشت گونج رہی تھی، جس یورپین یا امریکن سے بھی ملاقات ہوتی تھی وہ آرمینیا میں ترکوں کے مظالم کا تذکرہ کرتا تھا، اس کے لیے ناول لکھے گئے تھے، جس میں ترکوں کے مظالم کے ذہنی افسانے بیان کیے گئے تھے، اخبارات میں روزانہ قتل عام کے تار چھپتے تھے، چنانچہ ہاؤس آف کامنس میں بھی اکثر ممبروں کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ "چونکہ قسطنطنیہ میں بیٹھکر ترک آرمینیہ پر ظلم کرتے ہیں، اس لیے قسطنطنیہ ان کے ہاتھ سے چھین لینا چاہیے"، اخبارات میں اعلان شائع ہوتے تھے کہ مظلوم اور بیکس آرمینیوں کی حمایت کے لیے اپنے اپنے دائرے کے ممبران پارلیمنٹ کو تار دو اور اس پروپیگنڈے کا جواب صرف روپئے کے ذریعہ ہو سکتا تھا۔

وفد کی جدوجہد

ان حالات کی بنا پر ارکان وفد کو بڑی محنت اور جدوجہد سے کام لینا پڑا، اور ان کا سارا وقت مشغولیت میں صرف ہوتا تھا، اخبارات کے قائم مقاموں سے ملاقات، اہم مضامین کے جوابات، لوگوں سے ملنا جلنا، اخبارات کو پڑھنا، مخالف مضمونوں کا جواب لکھنا، وزراء اور ممبروں سے خط و کتابت، پہلے سے جو لوگ لندن میں اس کام کو انجام دے رہے تھے ان سے تبادلۂ خیالات، مجلسوں اور انجمنوں میں شرکت وغیرہ۔ (ع۔ بی ص ۱۴ و ۱۵)

قائمقام وزیر ہند سے وفد کی ملاقات

۲ مارچ ۷ بجے شام کو وزیر ہند مسٹر مانٹیگو کے قائمقام مسٹر فشر سے وفد کی ملاقات ہوئی، مولانا محمد علی اور مسٹر سید حسین نے بڑی آزادی اور صفائی سے اپنے مطالبات اور مسلمانوں کے خیالات پیش کیے اور کہا کہ "ہم کو انگریزی زبان میں کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا جو ادب کے ساتھ تنبیہ پیش کرنے کے مفہوم کو ادا کر سکے جس میں تہدید نہ ہو، سید حسین صاحب نے وفد کے مطالبات کے بارہ میں ہندوؤں کی تائید اور اس پر ہندوستان کے اتحاد و اتفاق کا ذکر کیا، اور موقع پاکر اس بارہ میں گاندھی جی کی مرتبہ یادداشت کے اقتباسات بھی سنائے۔

اس کے بعد مسٹر فشر سید صاحب کی طرف متوجہ ہوئے، انھوں نے خلافت اسلامیہ اور مقامات مقدسہ کی مذہبی حیثیت واضح کی اور کہا کہ نہ میں پولیٹیکل آدمی ہوں اور نہ جنکا میں قائمقام ہوں وہ پولیٹیکل ہیں، ہم لوگ خالص علمی و مذہبی خدمت گذار ہیں، اس لیے میرا اس وفد میں شریک ہونا خود اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ ہم جس مقدمہ کو آپ کی عدالت میں پیش کر رہے ہیں، وہ خالص مذہبی ہے۔

مسٹر فشر نے کہا وزیر اعظم اس وقت بہت مشغول ہیں، وہ وفد سے ملنے کی پوری کوشش کرینگے، مگر شاید جلسۂ صلح کے بعد، مولانا محمد علی نے جواب دیا کہ جلسۂ صلح کے بعد ان کا شرف ملاقات بخشنا بے کار ہے، ہم لوگ اپنی ذاتی غرض کے لیے نہیں بلکہ عرض مطلب کے لیے ان سے ملنا چاہتے ہیں، تعجب ہے کہ موسیو وینی زیلاس (ٹرکی کے حریف یونان کے وزیر اعظم) جب بھی چاہیں وزیر اعظم سے مل سکتے ہیں اور ہم مسلمانان ہند کے قائم مقام ایک دفعہ بھی انکے سامنے نہ جاسکیں،

مسٹر فشر نے آرمینیا کے مظالم کا تذکرہ کیا، مولانا محمد علی نے کہا ان فرضی قصوں کو کون باور کر سکتا ہے، اگر آپ واقعی حقیقت جاننا چاہتے ہیں تو مسلمانان ہند کا ایک کمیشن مقرر کر دیجئے اور ممکن ہو تو کسی انگریز جج کو بھی شامل کر لیجئے، اگر ترکوں کا قصور ہے تو ہم ان سے ہاتھ دھولینگے

کو تیار ہیں، مسٹر فشر نے جوابی تقریر میں کہا کہ مسلمان ہند اطمینان رکھیں ترکوں کے ساتھ صلح میں ہم ان کے مذہبی جذبات کا پورا لحاظ رکھیں گے گو مشکل یہ ہے کہ ہم تن تنہا نہیں، تاہم حتی الامکان کوشش سے دریغ نہ کریں گے۔

حکومت کے انڈیا سکریٹری صاحب نے جو کبھی بنگال کے گورنر رہ چکے تھے، فرمایا کہ مقامات مقدسہ کے دائرہ میں عراق کیونکر داخل ہو سکتا ہے، زیارت مقابر تو تمہارے یہاں جائز نہیں، مولانا محمد علی نے اس مولویانہ اعتراض کا یہ جواب دیا کہ ہاں ہمارے ایک فرقہ اہلحدیث کا خیال ایسا ہے، ورنہ تمام مسلمان اس کو جائز اور کار ثواب سمجھتے ہیں، خصوصاً شیعہ فرقہ زیارت عراق کو ضروری جانتا ہے، اور یہ کوشش کسی ایک فرقہ کے خیال کے مطابق نہیں بلکہ تمام فرقوں کی طرف سے ہے، (ع س، ص ۱۴ تا ۱۶)

سید صاحب کے فرائض و مشاغل

سید صاحب کا کام مطالبات کی مذہبی حیثیت کو بتانا، تاریخی اور مذہبی حیثیت سے انگریزی اخبارات میں وفد کے مطالبات سے متعلق جو مضامین نکلیں ان کا جواب دینا، اسلامی ملکوں کے مسلمانوں سے مل کر ان کو تحریک خلافت سے آگاہ کرنا تھا۔ چنانچہ مارننگ پوسٹ میں ایک اطالوی پروفیسر مشرقیات کا ایک مضمون "سلطان بحیثیت خلیفہ" شائع ہوا، سید صاحب نے اس کا جواب لکھا، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

دیکھئے کون اخبار چھاپے، کم بخت کہتا ہے کہ بغداد کی تباہی کے بعد سے خلافت دنیائے اسلام میں رہی نہیں "فیوچر آف خلافت" ان کا ایک رسالہ ہے، جو اطالین وزارت خارجہ کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔

مستشرقین سے مسئلہ خلافت پر خط و کتابت

سید صاحب نے وفد خلافت کے بارہ میں مستشرقین سے بھی خط و کتابت کی تھی، ایک خط میں لکھتے ہیں، یہاں کے مستشرقین میں براؤن ہمارے ساتھ ہیں، اور مارگولیتھ ہمارے مخالف، براؤن صاحب کو چار صفحے کا عربی میں مسائل حاضرہ پر

خط لکھا ہے اور ان سے تائید چاہی ہے، اپنی کتابیں بھی بھیجی ہیں، دیگر مستشرقین سے بھی اس مسئلہ میں خط و کتابت کا ارادہ ہے، (م ع، ص ۳۰)

مسٹر اسکولیتھ سے ملاقات

۱۰ مارچ کو مسٹر اسکولیتھ سے ملاقات ہوئی اور ڈیڑھ گھنٹے تک سوال و جواب ہوتا رہا (ع ح، ص ۲۱) چلتے وقت سید صاحب نے ان سے کہا "عیسائیت تو اپنی حمایت کے لیے بیسیوں حامی دین[1] سلاطین رکھتی ہے، کیا اسلام کو ایک حامی دین سلطان کی اجازت بھی نہ ملے گی، اس کا جواب مسٹر اسکولیتھ نے صرف ایک تبسم سے دیا۔ (م ع ص ۲۳)

وزیر اعظم سے ملاقات

لندن میں دو مہینے قیام کے بعد خدا خدا کر کے وہ وقت آیا جب وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج نے ملاقات کا موقع دیا، چنانچہ ۱۹ مارچ کو وفد ان کی خدمت میں باریاب ہوا، عربی اور فارسی کے یورپین عالم بھی بلا کر بٹھائے گئے تھے، ڈیڑھ گھنٹے تک ملاقات رہی، مولانا محمد علی اور مسٹر سید حسین نے بڑی خوبی سے اپنے مطالبات پیش کیے، لائڈ جارج نے اسکے جواب میں جس کو سوال سے کوئی تعلق نہ تھا، فرمایا کہ "سلف ڈٹرمیشن کا اصول عیسائی اور مسلمان سب حکومتوں کے لیے برابر ہے، تھریس میں یونانی زیادہ ہیں اس لیے وہ اس کے مستحق ہیں اور سمرنا میں گو مسلمان زیادہ ہیں لیکن وہ یونانی النسل ہیں، اس لیے اس کا بھی یونان مستحق ہے"! (ع ح، ص ۲۸)

مولانا محمد علی نے اس کا جواب دینا چاہا تو فرمایا ہم از سر نو مباحثہ کرنا نہیں چاہتے، اور نہ رات تک بیٹھنے کا یہاں خیال ہے، اور یہ کہکر اٹھنے لگے مگر اٹھتے اٹھتے مولانا محمد علی

---

[1] یورپ کے متعدد بادشاہوں خصوصاً انگلستان کے بادشاہ کے القاب میں ایک لقب حامی دین بھی ہے، اسی کی طرف اشارہ ہے،

نے یہ کہہ دیا کہ اس اصول کے مطابق بھی ٹرکی کے کسی صوبہ میں حتی کہ آرمینیا میں بھی عیسائی قوم کی کثرت نہیں ہے۔ (م۔ ع، ص ۳۰)

وفد کے مطالبات کی تائید میں ایک متفقہ جلسہ

مارچ کی آخری تاریخوں میں لندن میں مسلمانوں اور ترکوں کے ہمدرد انگریزوں کی جو انجمنیں تھیں ان سب کی جانب سے ایک متفقہ جلسہ ہوا جس میں ارکان وفد کے علاوہ قادر بھائی بیرسٹر بمبئی، ڈاکٹر عبد الحمید بیرسٹر مونگیر، مسز سروجنی نائیڈو، مسٹر ہارنیمن اور چند انگریزوں نے تقریریں کیں۔ (ص ۳۱)

حجاز اور شام کے عربی وفود سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات

اسی زمانہ میں حجاز اور شام کے وفود بھی اپنے مطالبات لیکر لندن آئے تھے، ان کے اور وفد خلافت کے مقاصد میں بڑا اختلاف تھا، اس لیے ان سے ملنا ضروری تھا، چنانچہ ۱۲ اپریل کو ان سے وفد خلافت کی ملاقات ہوئی، اس کی روداد سید صاحب ہی کے خط سے سننا زیادہ دلچسپ ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

حجاز و شام کا وفد لندن آیا ہے، نوری سعید پاشا اور حداد پاشا نائبین امیر فیصل اس کے سرگروہ ہیں، پہلے صاحب مسلمان اور دوسرے عیسائی ہیں، اور بھی چند مسلمان اور عیسائی ممبر ساتھ ہیں، ایک دن پہلے عربی میں ان سے خط لکھکر دریافت کیا کہ اگر کوئی امر مانع سیاسی نہ ہو تو ہم لوگوں کو ملنے کی اجازت دیجئے، ٹیلیفون سے جواب آیا کہ ۱۲ اپریل ۱۰ بجے ملئے، میں اور محمد علی صاحب ملنے گئے، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ملاقات رہی، نوری سعید ایک نوجوان تیز طبع اور ہوشمند شامی عرب ہیں، پہلے ترکی فوج میں لفٹنینٹ تھے، اور اب جنرل بنے ہیں، افسر فوج کی وردی میں تھے، بہت محبت اور تپاک سے ملے، میں نے عربی میں خلافت اور جزیرۃ العرب کے مسائل اور ہندوستان کے مسلمانوں کی کیفیت اور ان کے مطالبات مذہبی بیان کیے، اور ذرا موثر و شاعرانہ عبارت میں مطلب ادا کیا، وفد عرب کے اکثر ممبر انگریزی سمجھتے تھے، محمد علی صاحب سے نہ رہا گیا، انھوں نے انگریزی خطبہ

شروع کر دیا، ترک و عرب کے اختلاف اور جنگ نے اسلامی مصالح کو کہاں تک نقصان پہنچایا، اسکی تفصیل بیان کی، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب کا درد اور ملت کا غم زیر خاکستر انگارہ ہے، جو عرب و عجم و ترک ہر ایک کے دل میں کلمۂ اسلام سے گرم چھپا ہوا ہے، تقریروں کا سلسلہ ایسا موثر ہوا کہ دونوں کے دل بھر آئے اور آنکھوں سے اپنی بیکسی کے آنسو ٹپک پڑے، محمد علی کے دیدۂ پرنم نے اوروں کو بھی رولایا، جنرل نوری سعید نے کہا میں خدا و رسول اور اپنی عزت کا واسطہ دیتا ہوں کہ یہ یقین کرو کہ ہم نہ ترکوں کے مخالف تھے اور نہ ہیں، اور نہ خلیفۃ المسلمین سلطان المعظم کی خدمت کے منکر ہیں، اور نہ خاندان عثمان سے کوئی بغض و عداوت رکھتے ہیں، ہم کو ان چند نوجوان ترکوں سے مخالفت ہے جو سالہا سال سے ترکی کی عنان حکومت پر قابض ہو گئے ہیں، اور جن کی پالیسی ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام کے لیے مہلک ثابت ہوگی، یہ یقین کرو اور خدا و رسول کا واسطہ دیتا ہوں کہ یقین کرو کہ ہم عراق، شام و فلسطین و عرب کے استقلال تام اور آزادی کامل کے طالب ہیں، اگر ہماری زمین کا ایک چپہ بھی کسی نے دبانا چاہا تو ہم لڑیں گے اور لڑیں گے، اتحادی سلطنتوں سے تعلقات دوستانہ کے ہم دل سے خواستگار ہیں لیکن رعایا اور حاکم کے تعلقات ہم کبھی قبول نہ کریں گے، مسلمانان عالم کو ہم پر اعتبار کرنا چاہیے، عرب ترکوں سے زیادہ خدمت اسلام کے مدعی ہیں، ہم نے کہا اگر ہم کو یہ یقین ہو جائے کہ عرب موجودہ مشکلات عالم کا بار اٹھا سکیں گے اور دشمنوں سے مقابلہ کی طاقت پیدا کر سکیں گے تو ان سے زیادہ اسلام کی عزت و آبرو کا حامی اور کون ہو سکتا ہے؟ لیکن افسوس ہے کہ یہ یقین کرنے کے وجوہ ہمارے پیش نظر نہیں ہیں، صرف پر زور دشمنوں کا مقابلہ نہیں بلکہ چالاک ترین حیلہ ساز دشمنوں کا مقابلہ ہے، جن کے دعووں کے الفاظ مقابل کی قوت و ضعف کو دیکھ کر ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، جن کے فلسفۂ اخلاق میں عدل و انصاف اور صداقت و ایمانداری کے ابواب نہیں، جنرل نوری سعید نے کہا، تاریخ میں نے بھی پڑھی ہے

اور جانتا ہوں کہ احوال کیونکر بدلتے ہیں، ہم اپنے ملک کے لیے خالص آزادی کے طالب ہیں، کسی حکومت کی حکم برداری یا حمایت یا کسی اور قسم کی مداخلت ہرگز ہرگز گوارا نہیں کر سکتے۔

اس معاملہ میں تمام عرب، عیسائی، یہودی، مسلمان سب ایک دل و یک زبان ہیں، عیسائی ممبروں نے کہا کہ "ہم سب اس معاملہ میں متفق ہیں، ہم کو ارمنوں پر قیاس نہ کرو، ان کی قومیت الگ ہے، ان کی زبان الگ ہے، ہماری زبان ایک ہے اور ہمارا ملک ایک ہے"، ارمنوں کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ ان کی مظلومی اور قتل عام کی داستان محض یاروں کی گپ ہے اور وزارت قانون کی من گھڑت ہے، ہم ترکوں سے تھریس، قسطنطنیہ اور سمرنا چھین لینے کے حامی نہیں، وینز بلاس سے ہم نے یہ صاف کہہ دیا ہے، محمد علی صاحب نے کہا کیا ممکن نہیں ہے کہ جس طرح حکومت برطانیہ اور کنیڈا اور اسٹریلیا میں تعلقات شہنشاہی ہیں اسی طرح ممالک عرب میں پوری آزادی اور مستقل حقوق کے ساتھ خلیفۃ المسلمین کی شہنشاہی کے تحت قائم رہے۔ اس کا انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا،

میں نے کہا، مسلمانان ہند یہ تصور کرکے کہ عرب کی مقدس سرزمین بھی ان کے لیے اب امن و امان کا گھر نہیں، غمزدہ ہیں، وہ حاجیوں سے سنکر کہ وہاں انگریزی فوج برسر اقتدار ہے خون کے آنسو روتے ہیں، ہندوستان کے مقدس ترین عالم، علمائے ہند کے مسلمہ شیخ اور ہمارے ملک کے پیشوائے ملت و امام شریعت مولانا محمود الحسن صاحب نے ہندوستان سے ہجرت کرکے بلد الامین میں اقامت اختیار کی، وہ سیاست اور پالٹکس کے نام سے بھی آگاہ نہیں، وہ کفرستان ہند سے بھاگ کر نور و ایمان کے مسکن میں گئے تھے لیکن وہاں بھی انھیں پناہ نہ ملی،

کیا یہ بلد الحرام کی تحقیر نہیں، جو عاصی و آثم کا بھی مامن ہے، لیکن مامن نہیں تو اس مسلمان کا جو ملت بیضا، کا ہادی اور شریعت غزا، کا شارح ہے، ہمارے صوبہ کی کونسل میں جب ان کی قید کے متعلق سوال کیا گیا تو جواب ملا کہ ان کو برٹش گورنمنٹ نے نہیں بلکہ عرب گورنمنٹ نے قید کیا ہے، اگر یہ سچ ہے تو کیوں کر کسی عرب حکومت کی خود مختاری کا مسلمانان ہند کو یقین آئے، حداد پاشا نے کہا، میں نے بھی اس کے متعلق کچھ سنا ہے، نوری سعید نے کہا مجھے معلوم نہیں، میں اس کی تحقیق کروں گا، اور مولانا کا نام ایک کاغذ پر لکھ لیا، اس کے بعد شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوئے دروازے تک نوری سعید نے مشایعت کی۔

لیبر پارٹی کی ایڈوائزری کمیٹی سے ملاقات اور اس پر تنقید

لیبر پارٹی جس سے لندن میں کچھ امید ہے، اس کی ایڈوائزری کمیٹی سے ۱۰ / اپریل کو ملاقات ہوئی، ایک گھنٹہ تک گفتگو رہی، ۲۰ / اپریل کو دوبارہ ملاقات کا وعدہ کیا ہے، ۱۲ / اپریل کو عثمانی برطانی مجلس (برٹش اوٹومن سوسائٹی) کا جلسہ تھا، سر گرہیم صدر تھے، مقررین میں زیادہ تر انگریز تھے، ۲۲ / اپریل کو ہمارا ایک شاندار جلسہ ہونے والا ہے، لیبر پارٹی کے پیر مغاں جارج لینبری اس کے صدر ہوں گے۔

لندن کی لیبر پارٹی کی ان ہمدردیوں سے یہ قیاس نہ کیجیے کہ وہ اپنے مسلک میں جس اظہار فیاضی کے لیے تیار ہیں، اس سے ایشیا کی بیچارہ و بے بس قومیں بھی فائدہ اٹھا سکتی ہیں، انگلستان کی آزاد سے آزاد پارٹی بہر حال انگریز ہے، اور کبھی اس کے خصوصیات اس سے الگ نہیں ہو سکتے، لندن میں ہم لوگ ڈیڑھ مہینے کے قریب رہے، اور ہر طبقہ و فرقہ کے آدمیوں سے ملے، پیرس آئے، ابھی ایک دن گذرا ہے لیکن قسم بخدا کہ یہ ایک دن ڈیڑھ مہینے

ے بہتر تھا، اسلام اور مسلمانوں سے محبت رکھنے والوں کی تعداد بکثرت یہاں نظر آتی ہے۔ انگلینڈ میں ہمدردوں سے ہمدرد انگریز بھی صرف نفع زر کے لیے کام کرتا ہے۔ (مکتوب م ع، ص ۴۹)

اتحادیوں کا دلی منشا

وفد خلافت نے کوشش اور جدوجہد کا کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا تھا، مختلف انجمنوں اور مجالس سے بھی اس کی تائید ہو رہی تھی، بہت سے انگریز بھی حمایت میں تھے، بعض عمال حکومت بھی ظاہری تالیف قلب کر رہے تھے، مگر اتحادیوں کا اصلی منشا یہی تھا کہ ٹرکی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے، سید صاحب پر یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی تھی، ایک خط میں لکھتے ہیں:

معاملہ کی حالت یہ ہے کہ اتحادی یہ چاہتے ہیں اور کر رہے ہیں اور غالباً اس خط کے پہنچنے تک واقعہ ہندوستان کے اخباروں کے ذریعہ آپ کے سامنے بھی رونما ہو جائے گا کہ جب دستور قسطنطنیہ کے خائن وزراء کا ایک مجمع کر کے من مانی صلح کے کاغذ پر دستخط کرا لیں گے، اسی کے لیے سب کچھ ہو رہا تھا، ترکی پارلیمنٹ کے ان تمام ممبروں کو جو صحیح قومیت خواہی اور ملت پرستی کا جذبہ رکھتے تھے، ایک ایک کر کے پا بزنجیر مالٹا بھیج رہے ہیں، اور آج معلوم ہوا کہ خائنوں کی وزارت قائم ہو چکی، چند روز میں دستخط کی خبر بھی پڑھ لیجئے گا، انگریز اس وقت نہیں سمجھ رہے ہیں، اور ہر پُرقوت قوم اپنے عہد ترقی میں نہیں سمجھتی ہے، لیکن یقین کرنا چاہیے کہ انگریز قوم لائڈ جارج کے ہاتھوں اپنی شہنشاہی کا مقبرہ آپ تیار کر رہی ہے۔ (ایضاً ص ۵۲)

ترکوں کی مخالفت میں ایک کتاب

اتحادیوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے کیسی کیسی ذلیل تدبیریں اختیار کی تھیں، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہاؤس آف لارڈز کے ایک ممبر لارڈ برائس نے ترکوں کے مفروضہ مظالم پر تقریباً تین سو صفحوں کی ایک کتاب لکھی جو حکومت برطانیہ کی جانب سے شائع کی گئی ہے، اس میں مشنریوں، اخبارات اور دوسرے ذرائع سے کی ان تمام شہادتوں کو جمع کیا گیا تھا جس کی بنیاد پر ترکوں کا ظلم و ستم اور آرمینیوں کی معصومی و بیچارگی ثابت کی جا سکے۔

مختلف ملکوں کے مسلمانوں سے ملاقات اور انکی ترقی کے توقعات

اس زمانہ میں پیرس اسلامی وفد کا مرکز بنا ہوا تھا، مختلف ملکوں کے وفد یہاں آئے ہوئے تھے، سید صاحب نے ان سب سے ملاقات کی، اور ان کے دلوں کو آزادی کی تڑپ اور ترقی سے معمور پایا، چنانچہ ان کے مستقبل کے متعلق یہ پیشین گوئی فرماتے ہیں:

مختلف ملکوں اور مختلف سلطنتوں کے مسلمانوں سے مل کر یہ بات اچھی طرح پورے یقین کے ساتھ ذہن نشین ہو گئی کہ مسلمانوں کو قعر ذلت سے نکلنے کے لیے ان حوادث اور مصائب کی تنبیہ کی ضرورت تھی، اس لیے ان مسلمانوں کا احساس جو غیر حکومت میں رہتے ہیں، بہت تیز ہے، کیونکہ ان کے مصائب شدید تر ہیں، لیکن مسرت کی بات یہ ہے کہ اب ہر جگہ امید اور توقع کی روشنی نظر آتی ہے، مجھے اتنے ملکوں کے مسلمانوں سے ملنے کا موقع ملا، ٹرکی، شام، مصر، ٹیونس، روس، چین، ملایا، ہر جگہ ترقی کے آثار، خیالات کی بلندی، احساسات کی بیداری، دست برد زمانہ کا علم، جدید آلات عمل، جدید علم و فن، جدید تدبیر و سیاست سے آگاہی، اسلامیت کا درد، قومیت کا وجدان، اتحاد عالم کی پرزور خواہش، دوست و دشمن کی تمیز، دشمنوں سے کامل عداوت اور دوسرے ملکوں کے اسلامی بھائیوں کی تلاش و جستجو پیدا ہے۔

ایں بہ بیداری است یارب یا بخواب

مجھے یقین کامل ہو گیا ہے کہ دنیا ابھی ایک بار اور پلٹا لیگی، توقعات اور زیادہ پیدا کریں، موجودہ حوادث ایک بادل ہے جس کے پیچھے خوشی اور مسرت کی بجلیاں چمک رہی ہیں، نوجوان مسلمان ایک نوجوان اسلام پیدا کریں گے، پرانی دیواریں اگر گر گئیں تو گر جانے دیجئے، تیرہ سو برس پہلے کی مضبوط بنیادوں پر نئی دیواریں قائم ہو رہی ہیں۔ (برید فرنگ ص ۵۸)

مسٹر مانٹیگو سے دوسری ملاقات

آخر اپریل میں وزیر ہند مسٹر مانٹیگو سے دوسری مرتبہ ملاقات ہوئی،

بڑی ہمدردی سے گفتگو کی اور کہا میں تمھارے ساتھ ہوں اور رہوں گا، اور وہ دن دور نہیں جب میری جگہ کوئی مسلمان سکریٹری آف اسٹیٹ ہو، زیادہ سے زیادہ چھ برس کی دیر ہے، اگر ایرانی انگلش معاہدہ کے طریقہ پر عراق میں کارروائی ہو تو تم پسند کروگے، سید حسین صاحب نے کہا ہم ہندوستانی تو سمجھتے ہیں کہ ایران ختم ہوچکا ہے، جواب دیا نہیں، یہ غلطی ہے تم چند سال میں دیکھ لوگے کہ ایران اپنے پاؤں پر کھڑا ہے، مولانا محمد علی نے برجستہ کہا، مگر دوسرے کو ڈھکیل نہ سکے گا، مجھے ایک مثال بھی بتا دیجئے جہاں کوئی یورپین طاقت جاکر واپس آئی ہو، ہنس کر کہا "میسور، ہیلو گولینڈ"، یہ گویا ظریفانہ جواب تھا، یہ بات انھوں نے بھی تسلیم کی کہ کسی ایسے مسلمان یا ہندو سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی جو ابھی ہندوستان سے آیا ہو اور یہ نہ بیان کیا ہو کہ مسئلہ خلافت پر تمام ہندو مسلمان متفق ہیں، اور شدید جوش و خروش پیدا ہوگیا ہے،

آخر میں سید صاحب نے فرمایا کہ میں مولانا محمود الحسن دیوبندی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، جو مالٹا میں بے قصور نظر بند ہیں، حالانکہ ان کی نسبت لفظ پالٹیکس کا اطلاق ان کی تحقیر ہے، اس کا انھوں نے وہی جواب دیا جو صوبہ متحدہ کی کونسل میں مل چکا تھا کہ انکو برٹش گورنمنٹ نے نہیں بلکہ عرب گورنمنٹ نے قید کیا ہے، سید صاحب نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ عجیب تماشا ہے، مستند عرب ارکان سے جب ہم لوگوں نے پوچھا تو انھوں نے اس سے انکار کیا، محمد علی نے کہا "اگر عرب گورنمنٹ ان کو پسند نہیں کرتی تھی تو ہندوستان کے سپرد کردیتی، مالٹا تو اس کے حدود مقبوضات میں نہیں" مسٹر مانٹیگو نے اپنے سکریٹری کو اشارہ کیا کہ اس کو یادداشت میں لکھ لے، سوا گھنٹے یہ گفتگو رہی اور مولانا محمد علی اور سید حسین صاحب نے

بڑی دلیری اور صفائی کے ساتھ باتیں کیں، (برید فرنگ ص ۶۳)

مختلف اسلامی ملکوں کے مسلمانوں سے ملاقات

ارکان وفد کو اسلامی ملکوں کے مسلمانوں سے ملنے کا جو موقع ملتا تھا اس سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے، اور اس کا سلسلہ پورے سفر میں جاری رہا، چنانچہ پیرس و لندن میں بھی مصر، تونس اور تاتاری مسلمانوں سے ملاقات ہوئی ایک خط میں لکھتے ہیں:

پیرس میں خدیو عباس حلمی پاشا کے بھائی پرنس محمد علی کی ملاقات نہایت دلچسپ رہی، خود انھوں نے بلوایا، تیسرے دن ہمارے وفد نے بھی ان کو کھانے کی دعوت دی، مصری وفد نے ۱۶ اپریل کو پیرس میں ہمارے وفد کو ڈنر دیا، سعد زاغلول پاشا سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی، زیادہ تر وہ مجھ سے عربی میں باتیں کرتے رہے، خلافت اور جزیرۃ العرب کے مسئلہ میں وہ دل و جان سے شریک ہیں، لیکن کھلے دل سے بار بار مصریوں کی طرف سے معذرت چاہی اور ایسے اسباب بتائے جن کی بنا پر مصالحِ اسلام اس کے متقاضی ہیں کہ وہ زبان سے خاموش رہیں، تونسی مسلمانوں سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی، عبدالعزیز ثعالبی ان کے لیڈر ہیں اور پاس شدہ لیڈر، یعنی جلاوطنی اٹھا چکے ہیں، ملنے کے بعد میں نے پہچانا اور انھوں نے بھی پہچانا، ۱۹۱۳ء میں جنگ بلقان کے زمانہ میں کلکتہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی، وہاں کی عربی زبان اچھی ہے، جدید ترقی کے آثار نمایاں ہیں، وہاں کا جامع زیتون عربی کا سب سے بڑا مدرسہ ہے، ایک ہزار طالب علم اور چالیس کے قریب مدرس ہیں، پیرس میں فرنچ کی تعلیم کے تونسی طالبعلم ملے، بعض قانون بعض ڈاکٹری پڑھتے ہیں، پیرس میں میں نے عربی میں تقریر کی، اس کا فرنچ

ترجمہ ایک تونسی ڈاکٹر قرطبی نے سنایا، ان کے اجداد قرطبہ کے رہنے والے تھے، تاتاری مسلمانوں سے مل کر ان کی جدید ترقی کے حالات معلوم ہوئے، دو چینی مسلمان طالب علموں سے ملاقات ہوئی، ایک ملائی طالب علم لندن میں ملا۔ (بریدفرنگ ص ۶۴)

انگلینڈ اور فرانس کی جمہوریت کی حقیقت

یورپ کی جمہوریت کا ساری دنیا میں غلغلہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں بھی ایک خاص طبقہ کی حکومت رہتی ہے جس میں عوام کو کوئی دخل نہیں ہوتا، اور حقیقی جمہوریت وہاں بھی مفقود ہے۔

ہندوستان میں بیٹھکر یورپ کی جمہوریت اور آزادی و حریت کے بڑے قصے سنتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ عملاً یہاں بھی ارباب حکومت اس درجہ مستبد ہیں جس درجہ مشرق میں، عوام کو صرف یہ اختیار ہے کہ ممبر منتخب کریں، ممبروں کو یہ اختیار ہے کہ وزراء کو منتخب کریں، اس کے بعد نہ عملاً عوام کو ممبروں پر اور نہ ممبروں کو وزراء پر اختیار رہے، فرانس جو جمہوری ملک کہلاتا ہے وہاں کی حالت انگلینڈ سے بھی بدتر ہے، عوام کو حکومت کی پالیسی میں ذرہ برابر دخل نہیں، اب سمجھ میں آیا کہ یہاں سوشلزم کے برگ وبار پیدا کرنے کے کیا اسباب ہیں، یہاں امیر و غریب طبقہ معاشرہ میں اس درجہ بُعد ہے جس قدر خدا اور بندے ہیں۔

یکم مئی کو لندن میں مزدور پیشہ لوگوں کا ایک بہت بڑا جلوس نکلا، سب کے ہاتھوں میں سرخ پھول، گلے میں سرخ ٹائی اور جیب میں سرخ رومال اور کئی جھنڈے تھے، ہائڈ پارک میں جاکر جو یہاں کا سب سے بڑا باغ ہے، جلوس ختم ہوا، میرے ایک دوست کہتے تھے کہ ان میں کوئی حقیقی جوش نہ تھا، اور بر بنائے معلومات میری ذاتی رائے یہ ہے کہ انگریزوں میں نیشنل اسپرٹ

اس قدر ہے کہ انٹرنیشنل احساس ان میں مشکل سے پیدا ہوسکتا ہے۔ (بریدفرنگ ص ۶۷)

انڈیا آفس لائبریری کی سیر

لندن میں سید صاحب کے مذاق کی اصل چیز انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کی لائبریریاں تھیں، انڈیا آفس لائبریری جن میں اردو کی مطبوعہ اور قلمی کتب خانوں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے، اس لیے اس کو کئی مرتبہ دیکھا، ان کے متعدد مکاتیب میں اس کا ذکر ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں،

"میں نے پچھلی ڈاک میں آپکے نام انڈیا آفس لائبریری کی اردو کتابوں پر ایک مضمون لکھکر بھیجا ہے؛ پہنچا ہوگا[1]، اس میں قلمی کتابوں کا تذکرہ نہیں ہے، کیونکہ ان کی کوئی فہرست مرتب نہیں، تاہم میں نے پروفیسر اسٹوری (یہ پہلے علی گڑھ میں تھے، اب وہ یہاں اسسٹنٹ لائبریرین ہیں) سے کہدیا تھا کہ پروفیسر بلوم ہارٹ سے جو ان قلمی کتابوں کے انچارج ہیں، ملنا چاہتا ہوں، پروفیسر اسٹوری کا خط مانچسٹر میں ملا کہ وہ ۴ مئی کو ملیں گے، اتفاق سے واپسی جلدی ہوئی، اور چار کو حسب وعدہ انڈیا آفس میں بلوم ہارٹ صاحب سے ملاقات ہوئی، دیکھکر تعجب ہوا کہ وہ بہت بڈھے آدمی ہیں، ۸۰ سے کم عمر نہ ہوگی، بالکل سن سفید اور خمیدہ پشت ہیں، ۱۸۷۰ء میں ہندوستان گئے تھے، اردو عمدہ فصیح اور مخارج سے بولتے ہیں، برٹش میوزیم میں بھی اردو کا صیغہ ان ہی کے متعلق ہے، بہرحال، انھوں نے انڈیا آفس کی اردو کی قلمی کتابوں کی فہرست کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ مجھے دیا، یہ فہرست بھی بے ترتیب ہے، کوئی خاص ترتیب پیش نظر نہیں رکھی گئی ہے۔ اس سے کسی چیز کا نکالنا بہت مشکل نظر آیا، بہرحال اتنا معلوم ہوا کہ اردو کی کل ۳۰۰ قلمی کتابیں یہاں ہیں، یہ زیادہ تر دلی سے ہاتھ آئی ہیں، سعادت یار خان رنگین کی دس بارہ تصنیفات ہیں، ہندی کی قلمی کتابیں کل سو ہیں، ہندی بھی پروفیسر بلوم ہارٹ ہی سے متعلق ہے، پروفیسر موصوف اردو کے بہت مداح ہیں، اردو کو ہندوستان میں ذریعہ تعلیم بنانے کے موید ہیں، ہندی کے مقابلہ میں اردو کو ہندوستان میں زیادہ پھیلنے والی قوت تسلیم کرتے ہیں"

---

[1] یہ مضمون معارف جون ۱۹۲۰ء میں چھپا ہے۔

ملکی حقوق کے بھی حامی ہیں، ان کے مقابلہ میں نوجوان اسٹوری سچے انگلو انڈین ہیں۔ (برید فرنگ ص ۶۹)

اڈنبرا، مانچسٹر اور کیمبرج میں وفد کا دورہ اور پروفیسر براؤن سے ملاقات

وفد خلافت کی آواز کو پورے انگلستان کے کانوں تک پہنچانے کے لیے ارکان وفد نے اڈنبرا، مانچسٹر اور کیمبرج کا دورہ کیا، ان مقامات میں جلسے کرکے یہاں کے باشندوں کو اپنے مقاصد سے آگاہ کیا، اس کی تفصیلی روداد سید صاحب کے مکاتیب میں موجود ہے۔

کیمبرج میں پروفیسر براؤن سے ملاقات ہوئی، کیمبرج دیکھا، آپ کے معارف کے صفحات میں بھی اور انگلینڈ کی سرزمین بھی پروفیسر براؤن سے ملاقات ہوئی، بڑی مہربانی سے ملے، برابر مجھ سے ازراہ تلطف باتیں کرتے رہے، فارسی زبان میں گفتگو رہی، ان کو ایران سے بیحد محبت ہے، تاریخ جہاں کشا کی دو جلدیں مجھے ہدیہ دیں، اور یادگاری دستخط اس پر ثبت کیے، ترکوں کی نسبت ان کا خیال تھا کہ یورپ کے اہل سیاست نے نوجوان ترکوں کو کام کرنے کا موقع نہیں دیا، تونس اور الجیریا کی نسبت کہتے تھے کہ فرانس ان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتا، ایک فارسی اخبار ہندوستان کا نام "کاوہ" ہے، درفش کاویانی تو آپ کو یاد ہی ہوگا، اسی سے وہ لیا گیا ہے۔

پرسوں کاروان پھر دوبارہ انگلستان کو عبور کرکے پیرس جائے گا، ترکی ڈیلی گیٹ آج کل میں پہنچنے والے ہیں، مسٹر مانٹیگو نے ۶ ۲ اپریل کو وفد سے ملاقات کی تھی، کل پھر خاص محمد علی کو بلا کر دیر تک باتیں کیں، جن کی تفصیل کی اجازت نہیں، میری ذاتی رائے تو مانٹیگو صاحب کی نسبت یہ ہوتی ہے کہ وہ باتیں میٹھی کرتے ہیں اور بس۔ (ص ۸۰)

(باقی)

امام شافعیؒ اور انکی خدمات

از جناب حافظ محمد نعیم صاحب ندوی صدیقی ناظر کتب خانہ دارالمصنفین

نام ونسب محمد نام، ابو عبداللہ کنیت، ناصر الحدیث لقب تھا، جیسا کہ خود فرماتے ہیں: سُمّیت ببغداد ناصر الحدیث[۱]۔ اپنے جد اعلیٰ شافع کی نسبت سے شافعی کہلائے، جو صغار صحابہ میں سے تھے[۲]، ان کے والد سائب غزوۂ بدر میں مشرکین مکہ کے ساتھ تھے، ان کی شکست کے بعد قید ہوکر شرف اسلام سے بہرہ ور ہوئے تھے[۳]، امام صاحب کا سلسلۂ نسب یہ ہے، محمد بن ادریس بن العباس بن عثمان بن شافع بن السائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم بن عبد المطلب بن عبد مناف القرشی المطلبی۔

اس نسب نامہ کی بنا پر آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد بھائی ہوتے ہیں[۵]۔

جائے ولادت امام شافعیؒ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے، جائے ولادت کی تعیین میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے، صحیح تر قول یہ ہے کہ آپ کا مولد مقام غزہ ہے، جو بیت المقدس سے دو مرحلہ پر واقع ہے[۶]، مورخ ابن خلکان اور حافظ ابن عبد البر نے اسی قول کو اصح قرار دیا ہے[۷]۔

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۶۸، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۲، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۵۳، العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۳۴۴ [۲] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۷۲ [۳] التاج المکلل ص ۵۹ [۴] حسن المحاضرہ للسیوطی ج ۱ ص ۱۲۱ وطبقات الشافعیہ للمصنف ص ۲ [۵] تاریخ ابو الفداء ج ۲ ص ۲۶ [۶] کتاب الانساب للسمعانی ورق ۳۲۵ [۷] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۱۴، الانتقاء لابن عبد البر ص ۶۶

دوسرے قول میں عسقلان کو امام شافعی کا جائے پیدائش بتلایا گیا ہے، لیکن درحقیقت ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، کیونکہ غزہ اور عسقلان دونوں فلسطین کے سرحدی علاقے ہیں، اور پاس ہی پاس واقع ہیں، غزہ سے عسقلان کا فاصلہ صرف تین فرسخ ہے، عسقلان شہر ہے اور غزہ اسی کا نواحی قریہ ہے، اس لیے عسقلان کی طرف انتساب یا مجازاً ہے یا ممکن ہے ولادت غزہ میں ہوئی ہو اور ان کی والدہ نومولود کو لیکر عسقلان منتقل ہوگئی ہوں، جہاں آپ نے نشوونما پائی،[1]

علامہ ابن حجر نے ان دونوں روایتوں میں جمع وتطبیق کی یہی صورت نکالی ہے جو بالکل قرین قیاس ہے، جو قریے شہر کے قریب ہوتے ہیں ان کے باشندے عام طور سے شہر کی جانب منسوب ہو جاتے ہیں، امام شافعیؒ کے قول "ولدت بغزة فحملتنی امی الی عسقلان" سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے،[2]

امام شافعیؒ سے ایک روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ "ولدت بالیمن فخافت امی علی الضیعة نحملتنی الی مکة فقدمت متها دانا ابن عشر"[3] حافظ ذہبی نے اس قول کو غلط قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے قبیلہ یمن مراد ہو سکتا ہے، اور شیخ الاسلام ابن حجر نے اسے احمد بن عبد الرحمن راوی کا وہم قرار دیا ہے، دراصل روایت میں ولادت سے مراد نشات ہے، یعنی میری نشوونما یمن میں ہوئی،[4]

یاقوت حموی مذکورہ بالا روایت کو نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے: "اس کی تاویل محققین نے یہ کی ہے کہ یمن سے مراد وہ سرزمین ہے جہاں یمنی قبائل آباد ہوگئے ہوں، اور غزہ اور عسقلان کی کل آبادی یمنی قبائل پر مشتمل تھی، اگر مذکورہ بالا روایت صحیح ہے تو اس کی یہی تاویل میرے نزدیک احسن ہے"[5]

ابتدائی حالات آپ کے سنہ پیدائش میں کوئی اختلاف نہیں ہے،[6] جس روز امام اعظم ابوحنیفہؒ

[1] معجم الادباء ج ۶ ص ۳۶۸ [2] توالی التاسیس ص ۴۹ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] معجم الادباء ج ۶ ص ۳۶۸
[6] معجم المصنفین ج ۲ ص ۲۴۳

نے رحلت فرمائی اسی دن امام شافعیؒ کی ولادت ہوئی، نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں:

در ایں جا میان حنفیہ و شافعیہ مزاح است	اس واقعہ نے احناف وشوافع کے درمیان
خفیہ گویند امام شما مخفی بود تا آنکہ امام ما انتقال	ایک مذاق پیدا کردیا، حنفیہ کہتے ہیں کہ جب تک
کرد، شافعیہ گویند چوں امام ما ظاہر شد	ہمارے امام کا انتقال نہ ہوگیا تمہارے امام
امام شما بگریخت	چھپے رہے، شافعیہ کہتے ہیں، جیسے ہی ہمارے
(اتحاف النبلاء ص ۳۴۶)	امام ظاہر ہوئے تمہارے امام چلتے بنے۔

یافعی نے مراۃ الجنان میں بھی اس مزاح کا ذکر کیا ہے،[1] لیکن علامہ ابن حجر نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام شافعی کا سال ولادت اور امام ابوحنیفہ کا سال وفات (۱۵۰ھ) تو ایک ضرور تھا لیکن دن کی تعیین غلط ہے، کیونکہ محققین نہ امام شافعی کے ماہ ولادت کی صحیح تعیین کر سکے اور نہ امام اعظم کے ماہ وفات کی، اور خود امام ابوحنیفہ کے سال وفات میں رواۃ کا اختلاف پایا جاتا ہے، ۱۵۰ھ، ۱۵۱ھ اور ۱۵۳ھ تینوں منقول ہیں،[2]

علامہ بیہقی کا قول ہے کہ مجھے ایسی کوئی قوی روایت نہ مل سکی جس سے معلوم ہو کہ امام اعظمؒ کی وفات اور امام شافعی کی ولادت کا دن ایک ہی تھا، ہاں محققین اس پر متفق ہیں کہ سال ایک ہی تھا،[3]

جب امام شافعیؒ دو سال کے ہوگئے تو آپ کی والدہ جو صحیح قول کے مطابق قبیلۂ ازد سے تعلق رکھتی تھیں، آپ کو لیکر حجاز مقدس منتقل ہوگئیں، اور وہاں سے اپنے آبائی وطن یمن چلی گئیں، جہاں امام صاحب نے اپنی عمر عزیز کے دس سال گذارے، اور جب آپ کی والدہ کو نسبی شرافت کے

[1] مراۃ الجنان ج ۲ ص ۲۵ [2] توالی التاسیس ص ۵۰ [3] طبقات الشافعیہ للمصنف ص ۲

ضائع ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہوا تو پھر مکہ معظمہ واپس آگئیں۔[1]

امام شافعی کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی ذکاوت و ذہانت سے نوازا تھا، صغر سنی ہی سے آپ کی صلاحیتیں منظر عام پر آنے لگی تھیں، تیر اندازی، نیزہ بازی اور شہسواری میں پوری مہارت رکھتے تھے، خود امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ میں تیر اندازی بہت زیادہ کیا کرتا تھا، یہاں تک کہ طبیب نے کہدیا تھا کہ دھوپ میں زیادہ رہنے کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ کہیں تم کو سل کا مرض نہ ہو جائے،[2] لیکن اسی مشقت کی وجہ سے ان کی صحت قابل رشک تھی۔

ابتدا میں امام شافعی کو شعر و سخن سے بھی شغف تھا، چنانچہ قبیلۂ ہذیل میں جو عرب کا سب سے فصیح البیان قبیلہ تھا، رہ کر ان کی زبان و کلام میں ملکہ پیدا کیا، ہذلیین کے اشعار و دواوین ایسے ازبر تھے کہ اصمعی جیسے مستند ادیب و لغوی کا بیان ہے کہ "میں نے محمد ابن ادریس نامی ایک قریشی نوجوان سے ہذلیین کا دیوان پڑھا"۔[3]

علامہ سبکی نے امام شافعی کی شاعری پر تفصیلی بحث کی ہے، اور ان کے حکیمانہ اشعار بھی نقل کیے ہیں،[4] علامہ ابن حجر نے بھی ان کی شاعری کے متعدد نمونے دیے ہیں،[5] جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام شافعی کی شاعری دیگر شعراء سے یکسر مختلف اور صحیح معنی میں "ان من الشعر لحکمۃ" کا مصداق تھی، اس میں صرف شعر و ادب کی چاشنی اور حلاوت نہیں ہے، بلکہ وہ عقل و حکمت اور بصیرت و موعظت کا سبق ہے، ابھی حال میں مصر سے ایک کتاب دیوان الامام الشافعی کے نام سے چھپ کر شائع ہوئی ہے جس میں مختلف ماخذوں سے امام شافعی کے اشعار کو یکجا کیا گیا

[1] توالی التاسیس ص ۴۹ [2] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۰، [3] مناقب الامام الشافعی ص ۱۵۳، وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۱۴ و تاریخ ابو الفداء ج ۲ ص ۲۶، التاج المکلل ص ۹۵ [4] طبقات الشافعیہ للسبکی ج ۱ ص ۱۰۵ و ما بعد [5] توالی التاسیس ص ۴۳

امام شافعی کا دیوان ... ھجری میں ... شائع ... ہے ... ان دیوان میں ... کی ترتیب ہے ... صفحات میں ...

تحصیل و تکمیل علوم امام شافعی کو علم کا شوق بچپن ہی سے تھا، آپ کا ابتدائی زمانہ انتہائی مفلسی اور تنگدستی کی حالت میں گذرا، باپ کے سایۂ عاطفت سے صغر سنی ہی میں محروم ہو چکے تھے، غربت و افلاس کا یہ حال تھا کہ بقول امام رازی کہ جب وہ مکتب میں گئے تو معلم نے بے مائگی کی وجہ سے پڑھانے سے انکار کر دیا تھا،[1] خود امام صاحب فرماتے ہیں کہ

کنت فقیراً بحیث ما کنت املک	میں اتنا غریب تھا کہ کاغذ تک خریدنے کی
ما اشتری بہ القراطیس فکنت	مقدرت نہیں تھی، اس لیے ہڈی لے کر
آخذ العظم واکتب فیہا[2]	اس پر لکھا کرتا تھا،

لیکن یہ تمام مشکلات و موانع امام شافعی کی راہ ترقی میں حائل نہ ہو سکے، معلم کی بے اعتنائی کے باوجود مکتب میں بیٹھے رہتے اور استاذ بچوں کو جو اسباق پڑھاتا اسے زبانی یاد کر لیتے اور ہڈیوں پر لکھ لیتے، یہاں تک کہ اس نے جو کچھ بھی طلبہ کو پڑھایا امام صاحب نے سب یاد کر لیا،[3] اور اپنی ذہانت سے صرف سات سال کی عمر میں پورا کلام پاک حفظ کر لیا، پھر حدیث کی طرف توجہ کی تو دس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے موطا امام مالک کو بھی حفظ کر لیا،[4] ابن فرحون نے لکھا ہے کہ کان الشافعی حافظاً حفظ الموطا فی تسع لیال وقیل فی ثلاث لیال۔ لیکن خود امام شافعی کا قول ۹ ہی رات کا ہے،[5]

پھر فقہ کی جانب متوجہ ہوئے اور فقیہ مکہ مسلم بن خالد زنجی[6] کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے چشمۂ علم سے سیرابی حاصل کی اور فقہ میں بھی اتنا کمال پیدا کیا کہ ان کے شیخ نے پندرہ ہی سال کی عمر میں یہ کہکر فتوی نویسی کی اجازت دیدی کہ افت یا ابا عبد اللہ فقد آن لک ان تفتی،[7]

[1] مناقب الامام الشافعی ص ۱۶ [2] مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۸۹ [3] لواقح الانوار ج ۱ ص ۴۲ [4] حسن المحاضرۃ للسیوطی ج ۲ ص ۱۲۱، تاریخ بغداد ج ۲ ص ۶۳ [5] الدیباج المذہب ص ۲۲۸ [6] مسلم بن خالد زنجی مکہ معظمہ کے مفتی تھے، انکے بارے میں ناقدین فن اختلاف رائے رکھتے ہیں، بعض نے کہا کہ وہ ثقہ تھے اور بعض نے ضعیف قرار دیا ہے، ایک قول یہ بھی ہے کہ لیس بشیٔ، امام بخاری نے فرمایا کہ وہ منکر الحدیث تھے [7] طبقات الشافعیہ للمصنف ص ۲

کہ میں آپ نے مسلم بن خالد کے علاوہ مشہور محدث سفیان بن عیینہ سے بھی استفادہ کیا[۱] امام شافعی کے علم و فضل کے اتنے معترف تھے کہ فرماتے تھے ھذا افضل من فتیان اھل زمانہ اور جب کبھی کوئی تفسیری مسئلہ یا فتویٰ آجاتا تو امام شافعی کی طرف رخ کر کے فرماتے کہ ان سے دریافت کرو۔[۱]

مکہ میں تین سال تک تحصیل علم میں مشغول رہنے کے بعد مدینہ طیبہ کا رخ کیا، جہاں امام مالک بن انسؒ کا دریائے فیض رواں تھا، جب امام شافعی آستانۂ مالکی پر حاضر ہوئے تو ان کی عمر صرف تیرہ[۳] سال کی تھی،

امام مالکؒ سے مکالمت کی تفصیل خود ہی بیان فرمائی ہے، کہتے ہیں کہ جب امام مالک کی خدمت میں پہنچا تو میں مؤطا حفظ کر چکا تھا، میں نے عرض کیا میں آپ سے مؤطا پڑھنا چاہتا ہوں، امام مالک نے فرمایا کہ اچھا کسی کو بلا لاؤ جو تمہارے لیے قرأت کرے، میں نے جواب دیا کہ اسکی ضرورت نہیں، میں خود ہی پڑھوں گا، اور جب میں نے اس کی قرأت کی تو امام مالک نے بڑے تعجب کا اظہار کیا اور قرأت کو بہت پسند فرمایا[۲]، اور جب میں اس خوف سے قرأت ختم کرنا چاہتا کہ آپ پر بار نہ ہو تو فرماتے "اے نوجوان اور پڑھو" یہاں تک کہ میں نے بہت تھوڑی مدت میں مؤطا ختم کر لی[۳]، اسی بنا پر امام شافعیؒ، امام مالکؒ سے روایت کرتے وقت "اخبرنا مالک" کہتے ہیں،[۴] امام احمد فرماتے ہیں کہ قرأت کی پسندیدگی کی وجہ یہ تھی کہ امام شافعی بہت فصیح البیان تھے[۵]، آپ کو امام مالک کی خدمت میں صرف آٹھ ماہ رہنے کا موقع ملا، لیکن اس مختصر مدت نے بھی

---

[۱] طبقات الفقہا لشیرازی ص ۴۹ و الدیباج المذہب ص ۲۲۸ [۲] الانتقاء لابن عبد البر ص ۶۹ [۳] مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۹۰ [۴] حدثنا اور اخبرنا میں فرق یہ ہے کہ جب استاد پڑھے اور شاگرد سنے تو اس وقت روایت کرتے وقت شاگرد حدثنا کہتا ہے، اور جب اس کے برعکس استاذ سماعت کرے اور شاگرد قرأت کرے تو اس وقت اخبرنا کے لفظ سے روایت کیا جاتا ہے (شرح مسلم للنووی ج ۱ ص ۲۱) [۵] توالی التاسیس ص ۵۱

استاذ و شاگرد کے درمیان بہت گہرے روابط قائم ہو گئے، امام مالکؒ ان کے فہم و ذکا کی بہت تعریف کرتے تھے، جب امام شافعی نے مؤطا کی زبانی قرأت کی تو امام مالک نے برجستہ کہا تھا

ان یات احد یفلح فھذا الغلام — یہ نوجوان کامیاب ہوگا۔

امام شافعی بھی اپنے استاذ کا بیحد احترام کرتے تھے، فرماتے تھے کہ

مالک معلمی واستاذی ومنہ — مالک میرے معلم اور میرے استاذ ہیں

تعلمنا العلم وما احد امن علی — علم ان ہی سے سیکھا، ان سے زیادہ مجھ پر

من مالک وجعلت مالکا حجۃ — کسی کا احسان نہیں ہے، میں نے ان کو اپنے

فیما بینی وبین اللہ[۱] — اور اللہ کے درمیان حجت بنایا ہے۔

نیز جب امام مالک کا کوئی قول بیان کرتے تو کہتے: ھذا قول استاذنا مالک[۲]،

رحلات علمیہ ۱۷۹ھ میں جب امام مالک اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے تو امام شافعی پھر مکہ واپس آ گئے اور وہاں کے شیوخ و اساتذہ سے کسب فیض کیا، اس کے بعد امام صاحب کو فکر معاش دامنگیر ہوئی، حسن اتفاق سے والی یمن مکہ آیا ہوا تھا، بعض عمائد قریش نے اس سے سفارش کر کے امام شافعی کو نجران کا حاکم مقرر کرا دیا، لیکن یہ ملازمت آپ کے ذوق کے مطابق نہ تھی، اس لیے علمی کاموں کی جانب سے آپ کو بے توجہی ہونے لگی،

اسی اثنا میں والی یمن نے آپ کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا جس سے قدرت کی جانب سے خود بخود ملازمت سے علیحدگی کی شکل پیدا ہو گئی، امام شافعی قیام یمن کے دوران ایک ابتلاء و آزمائش میں مبتلا ہوئے، جس سے امام محمد کی سفارش پر خلاصی پائی،[۳] لیکن امام شافعی کو اس سے دو بڑے فوائد بھی حاصل ہوئے۔

---

[۱] الدیباج المذہب ص ۲۲۸ [۲] مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۹۰ [۳] الانتقاء لابن عبد البر ص ۹۸ و البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۵۲

(۱) یمن میں قیام کے دوران میں وہاں کے فضلاء سے استفادہ کا موقع ملا، جن میں مطرف بن مازن صنعانی[1] (المتوفی ۱۹۱ھ) اور عمرو بن ابی سلمہ[2] (المتوفی ۲۱۴ھ) مشہور ہیں،

(۲) یہ ابتلاء و آزمایش امام شافعی کے عراق جانے کا سبب بنی، اور ان کو امام محمد سے جو فقہ عراق کے امام تھے، استفادہ کا موقع ملا، عراق میں قیام آپ کی زندگی کا ایک اہم موڑ ثابت ہوا، امام صاحب کی بغداد میں یہ پہلی آمد تھی جو ۱۸۴ھ میں ہوئی، پہلی کی تصریح صرف ابن کثیر نے کی ہے[3]، ورنہ بغدادی اور ابو [illegible] نے اجمالاً قدم الی بغداد مرتین لکھا ہے[4]، امام شافعی کے بغداد پہنچنے کے دو سال قبل امام ابو یوسف رحلت فرما چکے تھے، بغداد کی علمی مسند پر امام محمد فائز تھے، جو فقہ عراقی کے صدر اعظم امام ابو حنیفہؒ کے تلمیذ رشید تھے۔

امام شافعی نے امام محمد کی خدمت میں تین سال رہ کر فقہ عراق میں کمال پیدا کیا، امام محمدؒ کے علاوہ عراق میں امام شافعی نے جن شیوخ سے استفادہ کیا ہے ان کے نام یہ ہیں: وکیع ابن الجراح (المتوفی ۱۹۰ھ)، حماد بن اسامۃ الہاشمی (المتوفی ۲۱۱ھ) عبد الوہاب بن عبد المجید المصری (المتوفی ۱۹۴ھ)، امام شافعی نے امام محمد سے جو کسب فیض کیا تھا، اس پر تا عمر ان کے ممنون رہے، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں نے امام محمد بن حسن سے جو کچھ پڑھا، سنا اور نقل کیا وہ بار شتر کے برابر ہے[5]

امام محمد بھی امام شافعی کی ذہانت و صلاحیت کے معترف تھے[6]، زیادی کا بیان ہے کہ

[1] مطرف بن مازن صنعانی کی یحییٰ بن معین نے تکذیب کی ہے، امام نسائی کا قول ہے کہ لیس بثقۃ، یہ صنعا کے قاضی تھے، اور رجل صالح تھے [2] امام اوزاعی کے شاگرد تھے [3] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۵۲ [4] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۵۶، تاریخ ابو الفداء ج ۲ ص ۲۶ [5] الانتقاء ص ۹۹، [6] بعض محققین نے لکھا ہے کہ امام محمد اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ نے خلیفہ ہارون سے امام شافعی کے خلاف شکایت کی تھی کہ وہ خلیفہ کو خلافت کے اہل نہ ہونے کا دعوی کرتے ہیں، سبحٰنک ھذا بہتان عظیم (البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۵۳)

میں نے امام محمد کو جیسی تعظیم امام شافعی کی کرتے دیکھا اور کسی کی نہیں دیکھا[1]،

بغداد سے امام شافعی مکہ مکرمہ واپس گئے، اور وہاں نو سال تک قیام کیا، اس طویل مدت میں وہ حرم شریف میں درس و تدریس کی بساط بچھائے رہے، امام احمد ابن حنبلؒ یہیں پر آپ سے ملے اور ایسے گرویدہ ہوئے کہ آپ کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے، یہیں پر امام شافعی نے فقہ جدید کی بنا ڈالی اور اجتہاد و استنباط کے اصول و ضوابط مرتب کیے،

۱۹۵ھ میں امام صاحب دوسری مرتبہ وارد بغداد ہوئے، اس مرتبہ آپ کی آمد طالب علم کی حیثیت سے نہ تھی، بلکہ اس وقت آپ کا آفتاب شہرت بغداد کے آسمان پر ضو فگن ہو چکا تھا، اور آپ کے مخالف و موافق سب کی زبانیں آپ کے فضل و کمال کے ذکر سے تر تھیں، امام صاحب اس مرتبہ بغداد میں دو سال رہے، اس عرصہ میں اکابر ائمہ اور جلیل القدر فقہاء و محدثین سے لیکر عام طالبان علم تک سب پروانوں کی طرح آپ کے گرد جمع رہتے اور علم کے اس سرچشمہ سے سیرابی حاصل کرتے، اسی قیام کے دوران میں امام صاحب نے قدیم اقوال پر مشتمل اپنی مشہور کتاب "الحجۃ" تصنیف کی[2]، جس کے چاروں رواۃ امام شافعی کے جلیل المرتبت شاگرد یعنی احمد بن حنبل، ابو ثور، زعفرانی اور کرابیسی ہیں[3]،

دو سال بغداد میں قیام کے بعد امام شافعی پھر مکہ واپس گئے، جہاں سے ۱۹۸ھ میں تیسری بار پھر بغداد آ گئے[4]، لیکن اس مرتبہ چند ماہ سے زیادہ قیام نہیں کیا، اور اسی سال امام موسیٰ کاظم کی شہادت کے بعد مصر چلے گئے[5]،

یاقوت حموی نے امام شافعی کے مصر جانے کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ عباس بن عبد اللہ

[1] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۱۵ [2] شرح المہذب للنووی ج ۱ ص ۹ [3] طبقات الشافعیہ للمصنف ص ۲
[4] ابو بکر مصنف نے دو ماہ کی تعیین کی ہے (طبقات للمصنف ص ۳) [5] ایضاً

والیٔ مصر نے ان سے ساتھ رہنے کی درخواست کی تھی[۱]،

لیکن امام صاحب کے مصر تشریف لے جانے کا صرف یہی ایک سبب نہیں تھا، بلکہ ان کو مصر جانے کا شوق اس سے بہت پہلے سے تھا، جس سے ان کے اشعار بھرے ہوئے ہیں،

درحقیقت سفر مصر کا اصلی مقصد اپنے مذہب کی ترویج و اشاعت تھا، حجاز و عراق میں ان کو اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو چکی تھی، اب انھوں نے ایک نئے میدان کی تلاش میں مصر کا رخ کیا تھا، چنانچہ ربیع کا بیان ہے کہ مجھسے امام شافعی نے اہل مصر کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے عرض کیا کہ وہاں دو مذہب کے لوگ پائے جاتے ہیں، مالکی اور حنفی اور دونوں اپنے اپنے اماموں کے اقوال کے پیرو و متبع ہیں، امام شافعی نے جواب دیا:

ارجوان اقدم مصر انشاء اللہ	میں انشاءاللہ مصر جاؤں گا اور ان کے سامنے
فآتیھم بشئ اشغلھم عن القولین	ایسی چیز پیش کروں گا کہ وہ دونوں
جمیعاً	مذاہب کو چھوڑ دیں گے

ربیع کا کہنا ہے کہ واللہ جب امام شافعی مصر آئے تو انھوں نے اسے سچ کر دکھایا[۲]، اور بقول شعرانی بہت سے علماء نے اپنے قدیم مذہب سے رجوع کر کے شافعیہ مذہب کو قبول کر لیا[۳]،

قول قدیم اور قول جدید | قول قدیم سے مراد امام شافعی کے وہ اقوال ہیں جو انھوں نے قیام مصر سے پیشتر مکہ، مدینہ، یمن اور بغداد میں قائم کئے تھے۔ بغداد میں انھوں نے کتاب "الحجۃ" تصنیف کی تھی، جو قدیم اقوال پر مشتمل ہے، اور امام صاحب کے مذہب قدیم سے مراد یہی کتاب ہوتی ہے[۴]،

جب امام شافعی مصر آگئے تو انھوں نے اپنے سابقہ خیالات و نظریات پر ازسرنو غور و تفحص کیا، اور بہت سے قدیم اقوال سے رجوع کر کے نئے نئے آراء قائم کیے، ان نئے خیالات

۱؎ معجم الادباء ج ۶ ص ۳۹۶ ۲؎ توالی التاسیس ص ۷۰ ۳؎ لواقح الانوار ج ۱ ص ۳۰۰ ۴؎ کشف الظنون ج ۱ ص ۴۲۰

کو قول جدید سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہیں امام صاحب نے اپنی جدید کتابیں الام، امالی الکبیر، املاء الصغیر، مختصر البویطی، مختصر المزنی، مختصر الربیع، الرسالہ، السنن تصنیف کیں[۱]، اور درحقیقت مذہب جدید ہی امام شافعی کی دائمی شہرت کا باعث ہوا،

چنانچہ امام شافعی نے بغدادی تصانیف جو قدیم اقوال پر مشتمل ہیں، سے روایت کی اجازت نہیں دی، علامہ نووی فرماتے ہیں، "امام شافعی نے اپنے قول قدیم سے رجوع کر لیا تھا، اور جب کوئی مجتہد اپنے کسی قول سے رجوع کر لے تو پھر وہ اس کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا[۲]"،

وفات | امام شافعیؒ نے مصر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، یہیں رجب کی آخری تاریخ ۲۰۴ھ کو علم و معرفت کی یہ شمع فروزاں گل ہوگئی[۳]، اس وقت عمر شریف ۵۴ سال کی تھی، ابو عثمان محمد کا قول مات ابی وھو ابن ثمان وخمسین سنۃ محل نظر ہے[۴]، کیونکہ آپ کے سنہ ولادت ۱۵۰ھ اور سنہ وفات ۲۰۴ھ پر محققین کا اتفاق ہے، اس کی رو سے عمر ۵۴ ہی سال قرار پاتی ہے، آپ کا مزار مبارک آج تک مرجع خاص و عام ہے۔

موت کا حقیقی سبب | امام شافعی کی موت کا سبب عام طور پر یہ مشہور ہے کہ فتیان ابن ابی السمح مالکی اور امام شافعی کے درمیان مناظرہ ہوا تھا جس میں فتیان نے کوئی نازیبا حرکت کی تھی اور معاملہ والی مصر کے پاس پیش ہوا، اس نے فتیان کو بلا کر سخت تنبیہ و توبیخ کی اس سے فتیان کے دل میں عناد پیدا ہو گیا، اور ایک شب میں اس نے امام صاحب کو لوہے کی زنجیر سے مارا، اس کے صدمہ سے امام شافعی ایسے سخت بیمار ہوئے کہ جانبر نہ ہو سکے۔

اس سبب کے متعلق حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ "لم ار ذلک من وجہ یعتمد[۵]" یعنی بالکل ناقابل اعتبار ہے۔

۱؎ حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۷۱، شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۰ ۲؎ شرح مسلم للنووی ج ۲ ص ۱۸۷ ۳؎ العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۳۴۳ ۴؎ طبقات الفقہاء للشیرازی ص ۴۸ ۵؎ توالی التاسیس ص ۸۶

ان کی موت کا اصلی سبب درحقیقت ان کی جانکاہ محنت تھی، مصر کے چار سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے تالیف و تدریس، مناظرہ اور اپنے مذہب کی اشاعت میں بڑی محنت کی، ان کے شاگرد ربیع کا بیان ہے کہ امام شافعی صاحب نے مصر کے دوران قیام میں ایک ہزار پانچسو صفحات املا کرائے، دو ہزار صفحے کی کتاب "الام" تصنیف کی، اسکے علاوہ کتاب السنن وغیرہ لکھیں، اور یہ سارا کام صرف ۴ سال میں اور بیماری کی حالت میں کیا[1]،

ازدواج و اولاد امام شافعی نے حمیدہ بنت نافع بن عنبسہ بن عمرو بن عثمان بن عفان سے نکاح کیا تھا، پسماندگان میں ایک صاحبزادے ابو عثمان محمد اور دو صاحبزادیاں فاطمہ و زینب یادگار چھوڑیں۔

ابو عثمان محمد سب سے بڑے تھے، اپنے والد کی وفات کے وقت مکہ میں رہتے تھے، خطیب نے انھیں شہر بغداد کا قاضی بتایا ہے، جو صحیح نہیں ہے، درحقیقت وہ جزیرہ میں قاضی تھے، پھر کچھ عرصہ تک شہر حلب کے منصب قضا پر فائز رہے[2]، اپنے والد ہی کی طرح علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے[3]،

شیوخ و تلامذہ امام شافعی نے علم و فن کے تمام سرچشموں سے سیرابی حاصل کی تھی، ان کے شیوخ کی تعداد کا صحیح اندازہ لگانا دشوار ہے، علامہ ابن حجر نے ان کی تعداد ۸۰ بتلائی ہے[4]، جن سے امام صاحب نے مکہ، مدینہ، یمن، عراق اور مصر میں کسب فیض کیا تھا،

[1] توالی التاسیس ص ۸۳ [2] طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۲۶ [3] امام شافعی کے ایک دوسرے لڑکے محمد نامی اور بھی تھے (الوافی بالوفیات ص ۱۱۴) جن کی کنیت ابو الحسن تھی، وہ دنانیر نامی ایک لونڈی کے بطن سے تھے، اپنے والد ماجد کے ہمراہ صغر سنی ہی میں مصر آئے اور وہیں اور وہیں سنہ ۲۳۱ھ میں فوت ہوگئے (طبقات الشافعیہ للسبکی ج ۱ ص ۲۲۶) [4] توالی التاسیس ص ۵۳

حافظ ابن کثیر صرف اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے کہ سمع الحدیث الکثیر علی جماعۃ من المشائخ والائمۃ[1] خطیب نے ان کے ۲۶ مشہور اساتذہ کے نام شمار کرائے ہیں[2]، ان میں امام مالک، امام محمد، سفیان بن عیینہ، مسلم بن خالد[3]، ابراہیم بن سعید، فضیل بن عیاض اور محمد بن شافع زیادہ مشہور ہیں[4]،

اسی طرح امام صاحب کے تلامذہ کی فہرست بھی بہت طویل ہے، دارقطنی نے ان کی تعداد سو سے زائد بتائی ہے[5]، اور حافظ ابن حجر نے ۱۶۳ کے نام شمار کرائے ہیں[6]، اس تعداد کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ تمام تلامذہ امام شافعی کی صرف ۵۴ سالہ عمر کی پیداوار ہیں، جس کی نظیر دیگر ائمہ میں مفقود ہے۔

ان تلامذہ میں ایک تعداد تو وہ ہے جو امام صاحب کے قول قدیم (بغدادی مذہب) کی راوی ہے، جیسے امام احمد، زعفرانی، کرابیسی، اسحاق بن راہویہ، موسیٰ بن جارود وغیرہ، دوسری جماعت وہ ہے جس نے جدید مذہب کی روایت کی، جیسے امام مزنی، ربیع بن سلیمان مرادی، بویطی، یونس بن عبد الاعلی، حرملہ، ابن عبد الحکیم حیری وغیرہ، ان سب نے امام شافعی کے علوم کو مرتب و مدون کیا،

امام صاحب کے مکہ، بغداد اور مصر کے مشہور تلامذہ کے نام مختصر تعارف کے ساتھ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ امام صاحب کے حلقۂ تلمذ میں کیسے کیسے اکابر اور نادرۂ عصر ائمہ داخل تھے،

۱- حمیدی- انھوں نے سفیان بن عیینہ سے کسب فیض کیا، یہ ان سے سب سے زیادہ صحیح

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۵۲ [2] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۵۶ [3] مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۹۲ [4] الدیباج المذہب ص ۲۲۷ [5] معجم الادباء ج ۲ ص ۳۹۱ [6] مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۳۹۱ [7] توالی التاسیس ص ۷۹ تا ۸۲ معجم المصنفین ج ۲ ص ۲۵۲ تا ۲۶۱

روایت کرنے والے تھے، مگر یہ امام شافعی سے تلمذ حاصل کیا، اور ان ہی کے ہمراہ مصر گئے جہاں وفات تک مقیم رہے، وہ امام بخاری کے کبار شیوخ میں ہیں، اور امام بخاری کے نزدیک اسناد کے اعتبار سے وہ سب سے زیادہ بلند و برتر تھے، اسی بنا پر امام بخاری نے اپنی جامع صحیح کا آغاز ان ہی کی روایت سے کیا ہے، ۲۱۹ھ میں وفات پائی۔

۲۔ **سلیمان بن داؤد**۔ یہ بہت بڑے عالم تھے، امام احمد تک ان کی انتہائی تعظیم فرماتے تھے، انھوں نے ابن ابی الزناد، اسماعیل بن جعفر اور ابراہیم بن سعد وغیرہ سے بھی استفادہ کیا، ان کے متعلق خود امام شافعی کا قول ہے کہ مارأیت اعقل من ھذین الرجلین احمد وسلیمان بن داؤد، ۲۲۰ھ میں فوت ہوئے۔

۳۔ **امام احمد بن حنبل**۔ آپ کی ذات والاصفات تعارف سے مستغنی ہے، آپ کے مناقب و حالات میں ائمہ نے مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں، ۱۶۴ھ میں ولادت ہوئی جس سال امام مالک کی رحلت ہوئی اسی سال امام احمد نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا، امام مسلم اور ابوداؤد کو آپ سے تلمذ حاصل تھا، امام احمد کا انتقال ۲۴۱ھ کے ربیع الاول میں ہوا۔

۴۔ **ابو ثور**۔ کبار فقہا میں تھے، بغداد میں امام شافعی کے حلقہ میں تفقہ حاصل کیا، امام احمد باین جلالت مرتبت ابو ثور کو بہت عظمت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور ان کے علم پر ان کو بڑا اعتماد تھا، ایک دن ان سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا، تو فرمایا کہ ابو ثور سے دریافت کرو۔ آپ امام احمد کے معاصر تھے، اور ان سے ایک سال قبل یعنی ۲۴۰ھ میں وفات پائی۔

۵۔ **حرملہ مصری**۔ ۱۶۶ھ میں پیدا ہوئے، اولاً ابن وہب وغیرہ سے استفادہ کیا، پھر جب امام شافعی مصر میں وارد ہوئے تو ان کے حلقۂ تلمذ میں آگئے، اور حدیث و فقہ میں مہارت حاصل کی، امام شافعی کی کتب جدیدہ کے رواۃ میں سے ایک یہ بھی ہیں، ۲۴۳ھ میں دار بقا کو سدھارے۔

۶۔ **زعفرانی**۔ امام شافعی کے مذہب قدیم کے رواۃ میں ہیں، امام بخاری نے اپنی جامع صحیح میں، اصحاب سنن نے اپنی سنن میں اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں ان سے روایات نقل کی ہیں، آپ بہت ہی فصیح البیان عالم تھے، اس لیے امام شافعی کے درس میں امام احمد اور ابو ثور جیسے فضلاء کے ہوتے ہوئے قرأت آپ ہی فرماتے تھے، ۲۶۰ھ میں رحلت فرمائی۔

۷۔ **المزنی**۔ ۱۷۵ھ میں پیدا ہوئے، علی بن معبد اور نعیم بن حماد سے کسب فیض کیا، پھر جب امام شافعی مصر تشریف لے گئے تو ان کی شاگردی قبول کی، اور فقہ کی مشہور کتاب مبسوط تصنیف کی، جو امام شافعی کی روایات پر مشتمل ہے، امام مزنی سے حجاز، شام، اور مصر کی خلق کثیر نے فیض حاصل کیا، ابن خزیمہ، زکریا الساجی، ابن حوص، ابن ابی حاتم، طحاوی ابی بکر نیشاپوری نے آپ سے روایت نقل کی ہے، ۲۶۴ھ میں عالم بقا کو رخصت ہوئے۔

۸۔ **یونس بن عبد الاعلیٰ**۔ ۱۷۰ھ میں ولادت ہوئی، سفیان بن عیینہ، ابن وہب، ولید بن مسلم، معن بن عیسی، ابی ضمرہ اور دوسروں سے استفادہ کیا، اور پھر امام شافعی سے تفقہ حاصل کیا، محمد بن الربیع، ابن خزیمہ اور ابوبکر بن زیاد وغیرہ نے آپ سے کسب فیض کیا، علم و فضل اور عقل و فہم میں امام شافعی کے ثانی تھے، ۲۶۴ھ میں وفات پائی۔

۹۔ **محمد بن عبد الحکم**۔ ۱۸۲ھ میں پیدا ہوئے، ابن وہب، ابی ضمرہ، بشر بن بکر، ایوب بن سوید، اور شعیب بن لیث وغیرہ سے تحصیل علم کی، پھر امام شافعی کے مصر آنے کے بعد ان سے فیض حاصل کیا، فقہ میں درجۂ کمال رکھتے تھے، نسائی، ابن خزیمہ، ابن صاعد، ابن ابی حاتم اور ابوبکر بن زیاد جیسے فضلاء نے ان سے روایات نقل کی ہیں، امام نسائی نے ان کی توثیق کرتے ہوئے ان کی ذکاوت و فطانت پر بڑے تعجب کا اظہار فرمایا ہے، خود امام شافعی کا قول ہے:

وددت لو ان لی ولداً مثلہ — کاش ان کے جیسا میرے لڑکا ہوتا۔

ابو اسحاق شیرازی کا بیان ہے کہ "انتہت الیہ ریاسۃ العلم بمصر"۔ آپ نے ۲۷۰ھ
میں انتقال فرمایا۔

۱۰۔ **ربیع بن سلیمان المرادی** ۔ ۱۷۴ھ میں ولادت ہوئی، عبد اللہ بن وہب،
ایوب بن سوید، بشر بن بکر، اسد بن موسیٰ سے علم حاصل کیا، پھر امام شافعی کی خدمت میں
حاضر ہو کر ان سے حدیث کی سماعت کی، امام شافعی کے علوم کی تدوین اور ان کی نشر و اشاعت
میں سب سے زیادہ حصہ آپ ہی کا ہے، امام ابو داؤد، نسائی، اور ابن ماجہ نے اپنی سنن
میں آپ سے روایات نقل کی ہیں، امام ترمذی نے سند بالاجازہ حاصل کی، آپ سے روایت
نقل کرنے والے دیگر لوگوں میں ابو زرعہ، ابو حاتم، زکریا الساجی، طحاوی اور ابو محمد بن صاعد
مشہور ہیں، امام نسائی اور ابو سعید بن یونس نے آپ کو ثقہ قرار دیا ہے۔[1]

(باقی)

---

[1] توالی التاسیس لابن حجر ص ۲، ۳ تا ص ۴۴ ملخصاً، نیز مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو طبقات الشافعیہ للسبکی ج ۱ ص ۱۸۶ و ما بعد۔

صوفیانہ اشارات اور اصطلاحات

از جناب ڈاکٹر صفدر علی بیگ صاحب۔ استاد شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی

زبان کا مسئلہ جس قدر اہمیت رکھتا ہے اسی قدر "اشاریت" (Symbolism)
کا مسئلہ بھی اہم ہے، زبان کا کام نرے حقائق کی تصویریں لفظوں میں پیش کر دینا ہی نہیں ہے، بلکہ ان کو
اشاروں اور کنایوں کے ذریعے سمجھانا بھی ہے، کسی خیال کی وضاحت کسی شے کی حقیقت کے اظہار
اور کسی طویل بات کو اختصار کے ساتھ مکمل طور پر بیان کرنے کے لیے اشاریت کا طریقہ سہولت بخش ہے،
خود زبان اشاریت ہی کی ایک شکل ہے، کیونکہ وہ ابتدائی زمانے میں کسی بات کو سمجھانے کے لیے اشارے
کے طور پر کام آتی تھی، ولبر مارشل اربن کہتا ہے کہ "زبان اپنی ترقی یافتہ حالت میں اشاریت کی شکل
اختیار کر لیتی ہے"۔ عہد حاضر میں اشاریت کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی ہے اس کی بنا پر کسی
زبان کا فلسفیانہ نقطۂ نظر سے مطالعہ ضروری ہو گیا ہے، اشاروں اور اشاریتی اشکال کا فلسفہ
کائنات ہستی کا ادراک اور شعور پیدا کرتا ہے، فلسفیانہ مسائل خود بخود اشاریت کے مسائل پیدا کر دیتے ہیں
اور فلسفیانہ مباحث کو سمجھانے کے لیے اشاریت ناگزیر ہے، اسی لیے اشاریت خود فلسفے کا ایک جز
بن گئی ہے، جارج وہالے کہتا ہے کہ اشاریت فنون لطیفہ اور خاص کر فن شاعری کے لیے ناگزیر ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اشاریت سے کیا مراد ہے، اشاریت کا اصل مطلب یہ ہے کہ وہ ملفوظہ لیکن شاذ
چیزوں کی توضیح کی جائے، پہلے کسی تخیل یا جذبے یا کسی شے کا واضح تصور ذہن میں ہو، پھر جن لفظوں یا
اشیا کے ذریعے ان کی مختصر، واضح اور صحیح تفہیم مقصود ہو ان کے بارے میں بھی مکمل علم اور واضح تصور ذہن

بھی ہونا چاہیے، اشاریت صرف خشک اور سادہ حقایق کا بیان نہیں بلکہ اس میں تخیل کی رنگ آمیزی بھی شریک ہے، کسی لفظ یا الفاظ کے مجموعے کے ایک لغوی معنی ہوتے ہیں لیکن اشاریت میں الفاظ کے معنی اور مطالب ان کے لغوی معنی سے بالکل جدا ہوتے ہیں، البتہ ان دونوں کے درمیان کوئی علاقہ یا تخیل کا ربط ضرور ہوتا ہے، اشاریت کسی خاص عقیدے یا تخیل یا جذبے کو کسی ایسی شے سے تعبیر کرنا جس سے ذہن مقرون سے مجرد کی طرف سہولت کے ساتھ منتقل ہو جائے، اشاریت کے لیے ایک خاص اشاریتی شعور ضروری ہے، جو صرف آگاہ ذہن کو حاصل ہوتا ہے، اشاریت صداقت اور تخیل دونوں پر مبنی ہوتی ہے، اس میں حقیقی و غیر حقیقی دونوں عناصر موجود ہوتے ہیں، اشاریت صرف ذومعنی بات ہی میں ہوتی ہے، اس حقیقت کو سیدھے سادے طور پر ظاہر کر دینا اشاریت نہیں ہے، اگر کوئی بات بالکل غیر حقیقی اور محض خیالی ہو اور کسی شے سے متعلق نہ ہو تو بھی اشاریت پر محمول نہ ہوگی، اشاریت دونوں پر موقوف ہے وہ جس واقعہ حقیقی کو الفاظ کا جامہ پہناتی ہے اس میں موسیقیت اور ترنم بھی پیدا کر دیتی ہے، وہ حقیقت اور تخیل دونوں سے مدد اور تہذیب و تنقید اور تحلیل و تجزیہ سے کام لیتی ہے، اشاریت سے کلام میں زور، عمق، رمزیت اور نزاکت پیدا ہو جاتی ہے، جارج وہالے کہتا ہے کہ جب شاعر حقایق ظاہری سے بیزار ہو جاتا ہے تو احساس حقیقت کا اظہار اشاریت کے ذریعے کرتا ہے،

اشاریت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اشیاء اور الفاظ کے اصلی معنوں کو قائم رکھتے ہوئے ان میں کچھ اور نئے معنی پیدا کر دیتی ہے جس سے ان کی نوعیت جداگانہ ہو جاتی ہے، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اشاریت میں جو الفاظ اور ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں وہ بظاہر بے معنی ہوتی ہیں لیکن درحقیقت بہت بامعنی اور غور و فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں، اس میں تنوع اور اختصار ہوتا ہے، تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ صد فی صد واضح نہیں ہوتی یعنی اشاریت میں جو الفاظ استعمال کیے جائیں ان کا مفہوم ہر کس و ناکس پر واضح نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے علم و نظر کی وسعت اور گہرائی، فہم و دانش اور مشاہدہ و تجربہ ضروری ہے،

مثلاً اگر "تاب زلف" کہکر اسرار الٰہی اور "خال سیہ" کہکر عالم غیب مراد لیا جائے تو عام آدمی جو اس مفہوم سے ناآشنا ہے، اس کو نہیں سمجھ سکتا، اشاریت میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور تلمیح سے مدد لیجاتی ہے،

رابن سکلٹن اشاریت کی تین منزلیں بتلاتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اشاریت کے لیے بصیرت اور قوت تخیل ضروری ہے، اس کے لیے پہلی منزل حقیقت نگاری، دنیوی ماحول سے مطابقت اور اشیا کے باہمی ربط و تعلق کا ادراک ضروری ہے، اس کے لیے ذہنی خاکے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا تعلق زندگی سے بالراست ہوتا ہے اور ان کی بصیرت باشعور ذہن کو ہو سکتی ہے، اس منزل پر شاعری محض سیدھے سادے تصورات اور تخیلات پر مبنی ہوگی۔

دوسری منزل میں حقیقت نگاری کسی قدر کم ہو جاتی ہے، ثانوی خاکے پیش نظر رہتے ہیں، مادی اشیا اور کائنات مدرکہ سے ماورا حقایق کا شعور رکھنے والے ذہن کی ضرورت ہوتی ہے، موقع محل کے شعور و آگاہی کے ساتھ ساتھ انسانی تجربہ بھی ناگزیر ہوتا ہے، اس منزل پر مشکل، دقیق اور نازک استعارات سے زبان بہت موزوں اور مناسب حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔

آخری منزل وہ ہے جب شاعری پوری طرح مشاہدہ حق سے متعلق ہو جاتی ہے، اس مقام پر شاعری میں اشاریت بہت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے،

لطیف اور نازک ترین تخیل کو واضح کرنے کے لیے اشاروں کے چند الفاظ کافی ہوتے ہیں، اشارہ معنی کے اعتبار سے دراصل ایک استعارہ ہے جو دو حقایق یا اشیا یا واقعات کے درمیان ہوتا ہے، یعنی ایک بنیادی حقیقت یا شے اور دوسری کوئی اور حقیقت یا شے جس سے متعلق بات کہی جائے، لیکن ان دونوں کے صفات کی یکسانیت ضروری ہے، جس قدر زیادہ ادراک اور آگاہی حاصل ہوگی اسی قدر کم لفظوں میں اشارہ ممکن ہوگا، کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ کسی ذہنی تصور کے تمام لوازمات کا

اظہار کیا جائے ، بعض اشارات لسانی اور بعض غیر لسانی ہوتے ہیں ، غیر لسانی اشارات کئی قسم کے ہوتے ہیں ، مثلاً کائنات کی اشیائے ظاہری ، عکس یا خاکے اور نشان وغیرہ ، جیسے سکہ اشارہ مبادلہ ہے ، قومی جھنڈا اشارہ حب الوطنی ہے ، صلیب یا علم مذہبی عقیدے کا اشارہ ہے ، ایسے اشارات کی حقیقت یا خصوصیت جب تک الفاظ کے ذریعے واضح نہ کیجائے ، سمجھ میں نہیں آتے ، قومی نشان ، صلیب یا علم ایک خاص جذبے اور عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں ، اور جامد وساکت اشارات ہیں جب لفظوں کے ذریعے ان کا مطلب واضح کیا جاتا ہے اس وقت انکی اشاریت واضح ہوتی ہے ، ولیم امپسن کہتا ہے کہ بعض معانی ایسے ہوتے ہیں جو زیادہ تجربہ حاصل ہونے سے سمجھ میں آتے ہیں ، اس نوعیت کے معانی اکثر و بیشتر شعرا ہی پیدا کرتے ہیں ، شعرا کا وجود اسی لیے ضروری اور اہم ہے ، شاعر کا بیان مفروضوں کے اظہار کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے ۔

اشاریت کا طریقہ یہ ہے کہ شعر میں ایک آدھ لفظ ایسا لاتے ہیں جو کسی خاص حقیقت یا ماحول یا شے کی طرف اشارہ کرتا ہے ، اگر ذہن اس لفظ کی مدد سے ان خاص معانی کی طرف رجوع ہو جائے تو شاعر کا اصل مطلب اور مقصد واضح ہو جاتا ہے ، مثلاً نظیر اکبر آبادی نے انسان کو دنیا کا مسافر قرار دے کر "بنجارہ" کا خاص نام دیا ہے :

"سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا"

فانی بدایونی نے روح انسانی کو "قیدی" کا نام دیا ہے ، کیونکہ وہ جسم مادی یا قفس عنصری میں قید ہے

فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے ۔۔۔ کیا کوئی وحشی اور آپہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

"زنداں" کے لفظ سے جسم مادی کی طرف اشارہ ہے ۔

جان گھبراتی ہے اندوہ سے تن میں کیا کیا ۔۔۔ تنگ احوال ہے اس یوسفِ زندانی کا ۔ میر

اس شعر میں ظاہر فریب اور ناپائیدار دنیا کے لیے "بتکدہ" اور "صنم کدہ" کے اشارات استعمال کیے گئے ہیں :

یگانہ اس بتکدے میں تو دل یہ بھی طلسم شکست غافل ۔۔۔ کہ کوئی کیسا ہی خوش شمائل صنم ہو آخر شکستنی ہے (ذوق)

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے ۔۔۔ صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ ۔ اقبال

معشوق مجازی کے لیے "بت" یا "صنم" اور کافر کے اشارے استعمال کیے جاتے ہیں ۔

چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کو پوجنا ۔۔۔ چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر ۔ غالب

صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے ۔۔۔ کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے ۔ (شاہ مبارک آبرو)

توجہ و انہماک اور جد وجہد کے لیے خونِ جگر کا استعارہ :

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر ۔۔۔ نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر ۔ اقبال

اشاریت اور ذو معنی لفظوں کی وجہ سے کوئی زبان نہایت مالا مال ہو جاتی ہے ۔

اشاریت نہ صرف اعلیٰ قسم کے فنونِ لطیفہ بلکہ اعلیٰ پایے کی شاعری کے لیے ناگزیر ہے ، اس کو دنیا کی ہر زندہ زبان میں غیر معمولی اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ اس کے ذریعے سائنس ، فلسفہ ، منطق مذہب ، تصوف اور مابعد الطبیعات کے سارے علوم و مسائل واضح ہوتے ہیں ، صوفیہ نے اس کے ذریعے اپنے افکار و خیالات اور مکاشفات و مشاہدات بیان کیے ہیں ، اس کے لیے انھوں نے مخصوص اصطلاحات وضع کی ہیں اور الفاظ میں معانی و مطالب پیدا کیے ہیں ، صوفیانہ اور حکیمانہ شاعری نے اشاریت کے ذریعے زبان و ادب کو مالا مال کیا ہے ،

فلسفہ ، مذہب اور مابعد الطبیعاتی مسائل کی تفہیم کے لیے اشاریت کو ضروری قرار دیتے ہوئے ولبر مارشل اربن کہتا ہے کہ مذہبی اشارے اشاریت کے عام نظریوں کے مقابلہ میں بہت دقیق ہوتے ہیں ، مذہبی زبان کا شاعری سے قریبی تعلق رہا ہے ، شاعری کے بہت سے اشارے مذہبی اشاروں سے مستفاد اور مربوط ہوتے ہیں ، جو مابعد الطبیعاتی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں ، اور اعلیٰ وارفع تصورات اور روحانیت کے نازک اور لطیف رازوں کو واضح کرتے ہیں ۔

مذہبی اشارات، مذہبی عقائد اور تصورات پر موقوف ہوتے ہیں، ان کا تعلق الہام سے ہوتا ہے، وہ سائنس اور فنون لطیفہ کے اشارات سے مختلف ہوتے ہیں، ان میں غیر معمولی عمق اور وسعت ہوتی ہے اور بیشتر اشارات مذہبی تصوں اور تلمیحات پر مبنی ہوتے ہیں، اشارات دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک مابعد الطبیعاتی جیسے ذات وصفات اور اعمال باری تعالیٰ سے متعلق، اور دوسرے اخلاقی جس طرح مابعد الطبیعاتی مسائل اپنی ایک زبان رکھتے ہیں، اسی طرح اخلاقی مسائل اور تصورات کی بھی خاص زبان اور خاص اصطلاحات ہوتی ہیں، مذہبی اشارات کو سمجھنے کے لیے مذہبی معلومات وسیع ہونا ضروری ہیں،

صوفیانہ اشارات دراصل کسی اخلاقی یا روحانی سبق کے اظہار کا ذریعہ ہیں، ایسے اشارات سراسر بصیرت سے تعلق رکھتے ہیں، ای ۔ ای ۔ سیجک کا خیال ہے کہ صوفیت اشاروں سے حیات پاتی ہے، اشاریت کے ذریعے ذاتِ مطلق ہمارے اضافی تجربوں میں داخل ہوتی ہے، ٹامس کارلائل کا خیال ہے کہ اشارے کے ذریعے لامحدود کو محدود کی مدد سے واضح کیا جاتا ہے، ساری کائنات دراصل خدا کی طرف وسیع معنوں میں اشارہ ہے، ذات وصفات باری تعالیٰ کو صوفی شعرا نے واضح کرنے کے لیے متعدد اشاروں سے کام لیا ہے، مثلاً "محیط" کا لفظ باری تعالیٰ کے وجود لامحدود کے لیے استعمال کیا گیا ہے،

هر ایک شے میں دیکھ بچار   محیط دیسے ٹھار یں ٹھار (جانم)
دکھائی دے جگہ جگہ

تو ہے محیط بے کراں میں ہوں ذرا سی آبجو   یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر (اقبال)

اسی طرح "سمندر"۔ "دریا"۔ "بحر" کے الفاظ وجود باری تعالیٰ کے لیے اور "موج"۔ "قطرہ" "حباب" اور "گرداب" مادی کائنات کے لیے مستعمل ہیں۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم   بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے (اقبال)

میں قطرہ ہوں لیکن بہ آغوشِ دریا   ازل سے ابد تک بہا جا رہا ہوں جگر

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر   ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا غالب

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر   یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں "

دھوکا ہے نظر کا ورنہ عالم ہمہ اوست   گرداب، حباب، موج سب پانی ہے امجد

صوفیہ عموماً توحید وجودی یا ہمہ اوست پہ عقیدہ رکھتے اور ہر شے میں خدائے تعالیٰ کے وجود لامحدود کا جلوہ دیکھتے ہیں، اس لیے ان اشاروں کے ذریعے اظہار کرتے ہیں، اور بھی بہت سارے اشارے صوفی شعراء کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں، مثلاً "چشمۂ حیواں" سے وجود باری اور "ظلمات" سے انسان کا وجود جسمانی مراد لیتے ہیں۔

دل کا چراغ ہاتھ لے، کر من عرف کی سیر   ظلمات بیچ چشمۂ حیواں کوں دیکھ توں سراج
کو دیکھ

"گنج مخفی" سے مرتبۂ احدیتِ ذات مراد ہے۔

کہیں گنج مخفی ہو پنہاں ہوا   کہیں ہو کے ظاہر درخشاں ہوا سراج

ذات باری تعالیٰ کے ساتھ عشق و محبت کے تعلق کی بنا پر اس کو "معشوق"۔ "جاناں"۔ "یار" "دوست"۔ "سجن" اور "محبوب" کا نام دیا گیا ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں   ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں غالب

چاروں طرف سے صورت جاناں ہو جلوہ گر   دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا آتش

آتش پہ شش جہت ہے مگر کوچۂ یار کا   چاروں طرف سے ہوتی ہیں ہم پر اشارتیں "

پہنچیں گے رہگذر یار تک کیونکر ہم   پہلے جب تک نہ دو عالم سے گذر جائیں گے ذوق

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست   مشغولِ حق ہوں بندگی بوتراب میں غالب

سجن کے باج عالم میں دگر نئیں   ہمیں میں ہے ولے ہم کو خبر نیں ولی
نہیں

شراب معرفت پی کر جو کوئی مجذوب ہوتا ہے — در و دیوار اسکوں مظہر محبوب ہوتا ہے — سراج

"زلف" کا لفظ مرتبۂ وحدتِ ذاتِ باری تعالیٰ، لاہوت، غیبت و ہویت یا عشق حقیقی کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔

آہوئے دل کہ وحشی صحرائے عقل تھا — تجھ زلف کا شکار ہوا کیا بجا ہوا — سراج

اسی طرح "بادہ"۔ "مے"۔ "شراب" کو اس کی صفات اور خصوصیات کی بنا پر صوفی شعرا نے عرفان اور عشق حقیقی (جو سالک کے دل پر اس طرح وارد ہو کر اسے مست و بیخود کر دے) کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً

جا دادِ بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہات — غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے — غالب

یارب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی — جادۂ ملکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل — اقبال

مسجد میں میکدے میں مجھے نشہ لے گیا — موجِ شراب جادہ تھی راہ ثواب کا — آتش

مذکورۂ بالا شعر میں "نشہ" سے عشق حقیقی یا شدتِ طلب مراد ہے، لفظ "مستی" سے عشق حقیقی کا غلبہ اور "سرور" سے عرفان، آگاہی اور معرفت مراد لیتے ہیں۔ جیسے

نہ کر تقلید اے جبرئیل میرے جذب و مستی کی — تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ — اقبال

صحبتِ اہلِ صفا نور و حضور و سرور — سرخوش و پرسوز ہے لالۂ لب آب جو — ،،

"شراب الست" سے ہنگامۂ عشق، پیمانِ عبدیت یا پہلی رویتِ الٰہی مراد ہے، "جامِ الست" بھی ان ہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست۔ (اقبال)

فقیر اپنی کمبل میں بیٹھا ہے مست — پیا پے چڑھاتا ہے جامِ الست۔ (بے نظیر شاہ)

"جام"۔ "پیالہ"۔ "سبو"۔ "ساغر"۔ "ایاغ" سے دلِ عاشق یا دلِ حق آشنا مراد ہے۔

لبریزِ مئے عشق ہے جامِ امجد — میخواروں میں ہے بلند نامِ امجد (امجد)

شکرانۂ ساقیٔ ازل کرتا ہے آتش — لبریز مئے شوق سے پیمانہ ہے اسکا (آتش)

مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانے میں — کہ میکدے میں تو خالی ہیں صوفیوں کے کدو (اقبال)

یارب اس ساغرِ لبریز کی مئے کیا ہوگی — جادۂ ملکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل (،،)

اہلِ دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہلِ نظر — کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ (،،)

"میخوار"۔ "مستاں"۔ "رنداں" کے الفاظ عاشقانِ حقیقی، عرفا اور مغلوب الحال درویشوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں، جیسے

تصورِ عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر — غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں — انشا

لبریز مئے عشق ہے جامِ امجد — میخواروں میں ہے بلند نامِ امجد — امجد

حاجیو طوفِ دلِ مستاں کرو تو کچھ لے — ورنہ کعبے میں دھرا کیا ہے بجز از سنگ و خشت — سوز

جا دادِ بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہات — غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے — غالب

"ساقی" کا لفظ مرشدِ کامل، عارفِ اسرار اور شرابِ معرفت پلانے والے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

مثالِ شیشہ کروں کیوں نہ سجدہ ساقی کو — شرابِ شوق ستی جامِ دل کیا لبریز — سراج

تصورِ عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر — غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں — انشا

"پیرِ خرابات" اور "پیرِ مغاں" سے بھی صوفیانہ شاعری میں مرشدِ کامل اور ہادیٔ برحق مراد ہے۔

مرید پیرِ خرابات یوں نہ ہوتے میر — سمجھتے عارف اگر اور بھی کسو کو ہم — میر

کیا ہے کس نے طریقِ سلوک سے آگاہ — مرید کس کا ہے پیرِ مغاں نہیں معلوم — آتش

"میخانہ" اور "میکدہ" سے وہ جگہ مراد ہے جہاں عشقِ حقیقی اور معرفتِ حق کی شراب ملتی ہے ..

اور سالکوں کی تربیت ہوتی ہے،

مسجد میں تو پوچھتا نہیں کوئی اے — میخانے میں دیکھنا مقامِ امجد — امجد
مسجد میں میکدے میں مجھے نشہ لے گیا — موجِ شراب جادہ بھی راہ ثواب کا — آتش

غالب نے اونچے درجے کے صوفیانہ اور فلسفیانہ نکات اور رموز کو واضح کرنے کے لیے اشاریت کو ناگزیر سمجھا ہے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر — غالب

"دل" یا "قلب" صوفیہ کے نزدیک جوہر نورانی اور لطیفۂ روحانی ہے جو خواہشاتِ نفسانی و دنیوی ہوا و ہوس سے پاک و پاکیزہ ہوتا ہے، جب تک وہ آلودہ رہتا ہے دل نہیں کہلاتا، صرف گوشت اور خون کا ایک لوتھڑا ہوتا ہے، جس کا کام صرف حرکت کرنا ہی، جب وہ گندگیوں اور نجاستوں سے پاک ہونے کے بعد نورِ ایمان اور انوارِ الٰہی کا محبط بنتا ہے، صوفیہ کو جو مکاشفات ہوتے اور ان پر جو واردات گذرتی ہیں اور جو انوار جلوہ گر ہوتے ہیں، سب کا محبط دل ہے، دل خانۂ خدا ہے، اس کی اہمیت کعبے سے بھی زیادہ ہے۔

یہ دل تو بے نہایت ہے — اس بوجھ کو ن امانت ہے (اسکو) — جاتم
او دل کہ جو عرش ہے خدا کا — منظور نظر ہے مصطفےٰ کا — بحری
عرش کا ہے کبھی کعبے کا ہے دھوکا اس — کس کی منزل ہے الٰہی مرا کاشانۂ دل — اقبال
حاجیو طوفِ دلِ مستاں کرو تو کچھ ملے — ورنہ کعبے میں دھرا کیا ہے بغیر از سنگ و خشت — سوز
قلب مومن کا اعلیٰ ہے — عرشِ ربِ تعالیٰ ہے — جاتم

"جنون" کے لفظ سے ایمان کا انتہائی درجہ اور وجدان [جو دنیوی علوم اور عقل کے مقابلے میں ایک غیر معمولی قوت ہے] مراد لیا گیا ہے۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں — مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر — اقبال

"دار و رسن" سے عاشقانِ حقیقی کی ابتلا و آزمائش مراد ہے۔

قصۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل — التجائے اَرِنی سرخیٔ افسانۂ دل — اقبال
شیوۂ منصور تھا اہلِ نظر کو بھی گراں — پھر بھی کس حسرت سے سب دار و رسن دیکھا کیے — اصغر

"حرم" کا لفظ دین و ایمان، عقیدہ، شریعت، اسلامی تہذیب اور بعض وقت مسلم قوم کے لیے استعمال کیا گیا ہے،

یہ حکمتِ ملکوتی، یہ علم لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں — اقبال

"قلندر" سے وہ عارف مراد ہے جو مرتبۂ تکلیف سے گذر جاتا ہے اور وہ فقیر مراد ہے جو عشقِ حقیقی میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اس کا بھروسہ صرف خدا پر ہوتا ہے

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر — ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر — اقبال

"کدو" سے علم و عرفان اور عشقِ حقیقی مراد ہے۔

مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانے میں — کہ میکدے میں تو خالی ہیں صوفیوں کے کدو — اقبال

کائنات مادی اور حق تعالیٰ کے تعلق کو سمجھانے اور مادی اشیا کے ذریعے اس کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے بہت سے اشارے استعمال کیے گئے ہیں، مثلاً آئینہ سے کائنات مادی مراد لیتے ہیں جس میں ذاتِ خداوندی کا حسن و جمال منعکس ہوتا ہے، اور وہ اس میں اپنا آپ مشاہدہ کرتی ہے۔

یہ وہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم — یا عالم آئینہ ہے اس یار خود نما کا — میر
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں — غالب

"پردہ"۔ "حجاب" اور "نقاب" کے الفاظ جہانِ مادی، وجودِ انسانی، جسم، محدودیت، فکر و نظر

اور خواہشات نفسانی کے لیے مستعمل ہیں، جو معشوق حقیقی اور عاشقوں کے درمیان حائل ہیں۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے (غالبؔ)

حجاب رخ یار تھے آپ ہم ہی کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا (دردؔ)

حجاب نے انھیں رکھا حجاب میں ورنہ جب آتے سامنے اپنا ہی سامنا کرتے (جگرؔ)

ہنسی پھڑانے لگی عشق کے فسانے کی نقاب اٹھاؤ بدل دو فضا زمانے کی "

جی۔ اے۔ گیاسکل کہتا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب اور مذہبی کتب میں اشاریت ایک عالمگیر حیثیت رکھتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانی تخلیق نہیں ہے، تمام مقدس باتوں کا اظہار صرف اسی ذریعے سے ممکن ہے، اکثر ایک ہی اشارہ مختلف کتب و مذاہب میں ایک ہی مفہوم رکھتا ہے، اس سے یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے کہ کتب مقدسہ اشخاص اور مصنفین کی تخلیقات اور تصنیفات ہیں، دنیا کے انسان اس قابل نہیں ہیں کہ وہ اس مبہم اشاریت کا علم پیدا کر کے کتب مقدسہ تصنیف کر سکیں۔

سی۔ ایم۔ باورا کا خیال ہے کہ اشاریت ابتدا سے صوفیانہ شاعری میں پائی جاتی ہے، اور وہ مابعد الطبیعات پر مبنی ہے، اس کے ذریعے پہلی مرتبہ شاعر کے انا یا خودی کی اہمیت واضح ہوئی، اس نے شاعری میں موسیقیت پیدا کر دی، اس کے ذریعہ لوگوں میں مذہب کی اشاعت ہوئی، مولانا شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ تصوف نے بہت سے نئے الفاظ، اصطلاحات، تلمیحات زبان میں داخل کر دیے، جن میں ایک ایک لفظ نے بہت سے گوناگوں خیالات کے لیے راستہ پیدا کر دیا، اس طرح شاعری کو نہایت وسعت حاصل ہو گئی، ڈاکٹر اعجاز حسین رقم طراز ہیں کہ زبان و بیان کے وجود میں آتے ہی مذہب نے اپنی سرپرستی عام کر دی، شاعری پیدا ہوئی تو اس کی رنگین نوائی اور گوناگوں خصوصیات سے متاثر ہو کر اور زیادہ دست شفقت بڑھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب شاعری

میں ایک خاص اتحاد پیدا ہو گیا، شاعری برابر مذہب کی خدمت کرتی رہی، اس کے عقائد کو طرز بیان سے دلنشین و پُر اثر بناتی رہی، مذہب ہمیشہ شاعری کی سرپرستی کرتا رہا، خیالات مواد اور الفاظ سے نشو و نما میں مدد کرتا رہا، دنیا کی کوئی ممتاز زبان مشکل سے ایسی ملے گی جس کی مذہب نے مدد نہ کی ہو، اردو زبان بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں، اس کو بھی مذہب مختلف طریقوں سے آگے بڑھاتا رہا، اردو شاعری کے قالب کی تشکیل میں فارسی ادب نے الفاظ، تراکیب، تلمیحات اور رمزیات سے مدد کی، مذہبی نقطۂ نگاہ سے ہماری شاعری میں ہر عقیدے سے زیادہ مواد صوفیانہ شاعری کا ہے،

اشاریت اور اصطلاحات میں فرق ہے، اگرچہ صوفیانہ اصطلاحات نے بھی صوفیانہ اشاریت کی طرح فارسی اور اردو زبان میں وسعت، گہرائی اور جدت پیدا کی ہے، صوفیانہ اصطلاحات اور صوفیانہ اشاریت کا فرق واضح کرنے کے لیے صوفیانہ اصطلاحات کی چند مثالیں دی جاتی ہیں، شعرائے اردو نے اپنے کلام میں جا بجا صوفیانہ اصطلاحات سے مدد لی ہے، مثلاً تخلیق عالم سے پہلے اشیائے عالم کا علم اور حقائق اشیا جو خالق کائنات کو معلوم تھے، اور جن کو معلومات الٰہیہ اور صور علمیہ بھی کہتے ہیں، صوفیہ کی اصطلاح میں "عین" اور "اعیان" کہلاتے ہیں،

آگے عالم عین تھا اس کا اب عین عالم ہے وہ اس وحدت سے یہ کثرت ہے یاں میرا سب گیان گیا (میرؔ)

ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیرا اعیان ہیں مظاہر ظاہر ظہور تیرا (دردؔ)

"جوہر و عرض" ممکن کا وجود بالعرض ہوتا ہے، اس لیے ہر آن اور ہر لحظہ وجود بالذات کا محتاج رہتا ہے، کیونکہ وہ قیوم ہے، حکما کے نزدیک جوہر وہ ممکن ہے جو مستقل ہوتا ہے، اور کسی محل یا موضوع میں نہیں پایا جاتا، صوفیہ کے نزدیک وجود کے سوا کوئی شے مستقل نہیں، جن کو حکما جوہر سمجھتے ہیں وہ بھی وجود کے اعراض یا صفات یا مظاہر ہیں۔

حقیقت تیری اصل جوہر و اعراض عالم ہے   تو پنہاں سب سے ہے پر سب سے ملتا ہے پتہ تیرا (توفیق)

"شریعت" دین کے ان بنیادی عقائد اور اوامر و نواہی کو کہتے ہیں جن کی پابندی ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت   جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی (اقبال)

"طریقت" اوامر و نواہی کی پابندی کے ساتھ ضمیر کی صفائی، اخلاق کی تطہیر اور تزکیۂ نفس کا نام ہے، صوفیہ کے نزدیک شریعت کا تعلق ظاہر سے اور طریقت کا تعلق باطن سے ہے، مثلاً نماز فقہی قوانین کے مطابق پڑھنا شریعت ہے اور نماز میں دل کو خدا کی طرف رجوع کرنا طریقت ہے،

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال   ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار (اقبال)

"حقیقت" شریعت اور طریقت کے منازل طے کرنے کے بعد انسان حقیقت تک پہنچتا ہے، علم حقیقت تین چیزوں پر مشتمل ہے، (۱) خدائے تعالیٰ کی ذات اور وحدانیت کا علم (۲) اسکی صفات اور اس کے احکام کا علم۔ (۳) اس کے فعل اور حکمت کا علم۔

حقیقت کے دریا میں غواص کر   اپنی معرفت میں مجھے خاص کر (سراج)

"سالک" وہ ہے جو راہ سلوک اختیار کرے، سلوک کے لغوی معنی نیک روی یا نیک چال چلنے کے ہیں، صوفیوں کے نزدیک خدا کی قربت ڈھونڈنے کے طریقے کو کہتے ہیں، سالک کے لیے شریعت کی پابندی ضروری ہے، اس کے بغیر سلوک جہالت و گمراہی ہے،

دید دنیا ہے رہ عشق میں سالک کو حرام   خوب ہے قطع نظر قطع منازل کے لیے (اکبر)

"شہود" سے مراد وہ کیفیت ہے جب سالک کو تمام موجودات میں اللہ ہی اللہ نظر آتا ہے،

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے   حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں (غالب)

"عینیت" سے ذوات خلق سے حق تعالیٰ کی معیت و قربیت، احاطت، اولیت و آخریت

اور ظاہریت و باطنیت مراد ہے۔ "غیریت" سے مراد کائنات مادی اور عالم کون و فساد کو ذات خداوندی سے علیحدہ حقیقت اور وجود ماننا ہے،

معرفت کی ہوا میں اڑنے کو   عینیت غیریت دو پر ہونا (شاہ کمال الدین کرم کنڈی)

"غیب الغیب یا غیب غیب" مرتبۂ احدیت ذات جو عقل و ادراک و بصیرت سے ماوراء ہے

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود   ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں (غالب)

"معرفت"۔ معتزلہ کا خیال ہے کہ معرفت علم اور عقل سے ہوتی ہے، حضرت شیخ علی ہجویریؒ نے اس کی تردید کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ معرفت علم اور عقل سے ہوتی تو ہر عالم و عاقل عارف ہوتا، معرفت اس بندے کو حاصل ہوتی ہے جس پر خداوند تعالیٰ کی عنایت ہو، عقل اور دلیل معرفت کا ذریعہ ہو سکتی ہے، مگر علت نہیں ہو سکتی، علت صرف خدا کی عنایت ہے، حضرت عبد اللہ بن مبارک کا خیال ہے کہ معرفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی چیز پر تعجب نہ ہو، کیونکہ تعجب اس فعل سے ہوتا ہے جو مقدور سے زیادہ ہو، خدائے تعالیٰ ہر کمال پر قادر ہے، تو عارف کو اس کے افعال پر تعجب کیوں ہو

شراب معرفت پی کر جو کوئی مجذوب ہوتا ہے   در و دیوار اسکو ں مظہر محبوب ہوتا ہے (سراج)

"الہام" یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بات عارف اور سالک کے دل میں ڈالی جائے

ہو بندۂ آزاد اگر صاحب الہام   ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لیے مہمیز (اقبال)

"کشف" سے سالک کے دل پر اسرار الٰہی کا یک بیک کھل جانا مراد ہے، علم باطنی کا حصول بھی کشف سے ہے،

بھولے ہیں ہر صنم کے کرشمے پہ ہوش کوں   ان زاہدوں میں کشف و کرامت نہیں رہا (سراج)

"مراقبہ" سے مراد خدائے تعالیٰ کی طرف دل کی حضوری ہے صوفیہ کے نزدیک مراقبہ کرنے والے کو احساسات کے ذریعہ سے نہیں بلکہ وجدان کے ذریعہ خدائے تعالیٰ سے ربط پیدا ہوتا ہے، اور اس کا اپنا "انا" ایک لامحدود "انا" یعنی ذاتِ حق میں گم ہو جاتا ہے،

یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں (اقبالؔ)

"مشاہدہ" تجلیاتِ الٰہی کے دیدار کو کہتے ہیں،

وہ علم کم بصری جس میں ہم کنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم (اقبالؔ)

"ہائے و ہو" غلبۂ عشق حقیقی میں نالہ و فریاد کرنے کو کہتے ہیں۔

گرمیِ آرزو فراق، شورشِ ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرے کی آبرو فراق (اقبالؔ)

"وصال" سے مراد اللہ تعالیٰ کا قرب اور فنائیت ہے۔

عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب (اقبالؔ)

دیوان منسوب بہ منصور حلاج

از

جناب محمد شکیل احمد صاحب صدیقی ایم اے شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی

انا الحق کہنے والے حسین بن منصور حلاج کا نام غیر معمولی شہرت رکھتا ہے، یہاں تک کہ منحرف حق بھی اس نام سے اسی طرح آشنا ہیں جس طرح وابستۂ حق، اس لیے ان کے تعارف کی ضرورت نہیں، حال ہی میں ان کی طرف منسوب ایک فارسی دیوان نے نگاہِ شوق کو اپنی طرف کھینچ لیا، لیکن اس کے مطالعہ کے بعد بڑی مایوسی ہوئی اور اس نتیجہ پر پہنچنا پڑا کہ یہ دیوان نعرۂ انا الحق بلند کرنے والے حسین بن منصور کا نہیں ہے۔

دیوان ۲۵۵ صفحات پر مشتمل ہے، تخلص حسین نظم ہوا ہے، مطبع زہرہ ایران میں زیرِ اہتمام کتابخانہ سنائی چھپا ہے، دیوان کے شروع میں جناب ولی اللہ یوسفیہ کا ۲۵ صفحات کا مقدمہ ہے، جس میں عشق، اس کی ہمہ گیری اور تاثیر پر فاضلانہ بحث ہے، مختصراً منصور کے حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس مقدمہ سے قبل ایک صفحہ کا مقدمۂ ناشر ہے، جس میں ناشر نے لکھا ہے کہ میرا کام ان اشعار کو مدون اور نشر کرنا تھا جو میں نے انجام دیا، لیکن اس بات کی تحقیق کرنا کہ یہ اشعار منصور حلاج کے ہیں یا نہیں محققوں کا کام ہے، اس تحریر نے ناشر کی ذمہ داری کو بڑی حد تک ہلکا کر دیا، مگر فاضل مقدمہ نگار ولی اللہ یوسفیہ نے اس کو منصور حلاج کا کلام یقین کر لیا، اگر انھوں نے نگاہِ تحقیق سے اس کو دیکھا ہوتا تو یہ چیز خود

ان پر منکشف ہو جاتی کہ یہ دریائے عشق کے غواص حسین بن منصور حلاج کا کلام نہیں ہو جس کے مندرجہ ذیل وجوہ ہیں:

۱۔ حسین بن منصور کے ہم عصر مشہور مورخ طبری یا ان کے بعد کے بھی کسی تذکرہ نگار نے یہ نہیں لکھا کہ وہ فارسی میں شعر کہتے تھے، حسین بن منصور کے حالات صاحب کشف المحجوب نے بڑی ارادت و عقیدت سے لکھے ہیں، یہ صوفیائے کرام کے حالات سے متعلق پہلی کتاب ہے، اور منصور حلاج کے عہد سے قریب تر یعنی پانچویں صدی ہجری کے وسط کی تالیف ہے، اس کے مؤلف حضرت شیخ ابو الحسن علی بن عثمان بن ابو علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخشؒ ان کا شمار اکابر صوفیہ میں ہے، اس سلسلہ کی دوسری اہم تصنیف خواجہ فرید الدین عطار کی تذکرۃ الاولیا ہے، ان دونوں کتابوں میں ان کی تصانیف کی کثرت کا ذکر ہے، ہجویری نے یہ بھی لکھا ہے کہ حسین بن منصور حلاج کی پچاس تصانیف بغداد اور اس کے نواح میں ان کی نظر سے گذری ہیں[1]۔ نیز یہ کہ ان کی بعض تصانیف ابو جعفر بن المصباح الصیدلانی سے پڑھنے کا بھی ذکر کیا ہے[2]، لیکن ان کے دیوان یا فارسی اشعار کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے، وہ شعر ضرور کہتے تھے لیکن عربی میں، قرطبی نے صلۂ تاریخ طبری میں ان کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں[3]، ہجویری نے بھی ایک جگہ ان کے تین اشعار اور خواجہ فرید الدین عطار نے دو شعر نقل کیے ہیں، جن کو آگے پیش کیا جائے گا، اسی طرح رضا قلی ہدایت نے ریاض العارفین میں ان کے جو دس اشعار نقل کیے ہیں، وہ بھی عربی میں ہیں، اگر فارسی کے بھی اشعار ہوتے تو کہیں نہ کہیں ان کا فارسی شعر ضرور نقل کیا گیا ہوتا،

[1] کشف المحجوب ص ۱۹۱ مرتبہ از روسی متن والینتن ژوکوفسکی مطبوعہ طہران [2] ایضاً ص ۲۱۵

[3] صلۂ تاریخ طبری قرطبی ص ۹۷ و ۹۸

۲۔ صاحب کشف المحجوب اور صاحب تذکرۃ الاولیا نے جہاں بھی منصور کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ نقل کیے ہیں وہ سب عربی میں ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی تحریر و تقریر کی زبان عربی تھی،

۳۔ حسین بن منصور حلاج تیسری صدی ہجری میں گذرے ہیں، چوتھی صدی ہجری کے شروع یعنی ۳۰۹ھ میں ان کے دار پر لٹکائے جانے کا واقعہ پیش آیا، اس زمانہ میں فارسی شاعری اپنے عہد طفولیت میں تھی، اور اس کا بادا آدم رودکی سمرقندی بھی عالم وجود میں نہ آیا تھا، لہذا ایسی آسان اور رواں زبان جیسی کہ اس دیوان کے اشعار کی ہے، کبھی بھی اس دور کی نہیں ہو سکتی، اگر یہ کلام منصور حلاج کا ہوتا تو تذکرہ نگار رودکی کے بجائے فارسی شاعری کا بادا آدم ان ہی کو قرار دیتے اور غزل میں پیغمبری کا سہرا بجائے سعدی کے ان کے سر بندھتا،

۴۔ حسین بن منصور حلاج سے منسوب اس دیوان میں چند قصائد اور زیادہ تر غزلیں ہیں، دیوان کی ابتدا جس قصیدہ سے ہو رہی ہے وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ و ائمہ کی شان میں ہے، اور مندرجہ ذیل مطلع سے شروع ہوتا ہے،

اے دور ماندہ از حرم خاص کبریا سوئے وطن رجوع کن از خطۂ خطا

لیکن درحقیقت یہ قصیدہ حسین بن منصور حلاج کے بجائے ملا حسین واعظ کاشفی کا ہے، جس کے گیارہ اشعار رضا قلی ہدایت نے ریاض العارفین میں ملا صاحب کے نمونۂ کلام کے سلسلہ میں نقل کیے ہیں[1]، زیر بحث دیوان میں ایک قصیدہ ذیل کے مطلع سے شروع ہوتا ہے ؎

گر من سر از نشیمن دنیا بر آورم گرد از قمار طارم اعلیٰ بر آورم

[1] ریاض العارفین ص ۱۰۸ مطبوعہ چاپخانۂ آفتاب طہران طبع دوم،

یہ قصیدہ خاقانی کے اس مشہور قصیدہ کی زمین میں ہے:

ہر صبح سر ز گلشن سودا بر آورم | وز صور آہ بر فلک آوا بر آورم

خاقانی کا یہ طویل قصیدہ پچاسی[۸۵] اشعار پر مشتمل ہے، اور حسین بن منصور حلاج سے منسوب قصیدہ میں تیس[۳۰] اشعار ہیں، ذیل میں ہم دونوں کے چند اشعار تقابلی مطالعہ کیلئے درج کر رہے ہیں:

اشعار خاقانی	اشعار منسوب بہ منصور حلاج
قندیل دیر چرخ فرو میرد آں زماں	آتش فروزم از دل و در عالم افگنم
کاں سرد باد ز آتش سودا بر آورم	تا من دخاں ز دخمۂ سودا بر آورم
خود بے نیازم از حشر اشک و فوج آہ	شوریدہ وار از بنہ آخر الزماں
کاں آتشم کہ یک تنہ غوغا بر آورم	آشوب و شور و فتنہ و غوغا بر آورم
دل در مغاکِ ظلمتِ خاکی فسردہ شد	در ہستیم ز مستی خود دستم ار دہد
رختش بتابِ خانۂ بالا بر آورم	جانم ز نیستی سوے بالا بر آورم
زمزم فشانم از قرہ در زیر ناودان	گر شرح درد خویش بگویم بکوہسار
طوفانِ خوں ز صخرۂ صما بر آورم۔	بس خونِ دل ز صخرۂ صما بر آورم
دریائے سینہ موج زند ز آب آتشیں	کشتی عقل بشکنم اندر محیطِ عشق
تا پیشِ کعبہ لولوئے لالا بر آورم	در قعرِ بحر لولوئے لالا بر آورم
دیباچۂ سراچۂ گل خواجۂ رسل	گر در سرائے غفلتم آسودہ باک نیست
کز خد منقش مراد مہنا بر آورم	از خوانِ فضل نقل مہنا بر آورم
امروز کز ثناش مرا ہست کوثرے	از عرش مرغ سدرہ فرود آورم بفرش
بخت از گو ثری بثریا بر آورم	خاکِ ثری باوجِ ثریا بر آورم

حسین بن منصور کی طرف منسوب اشعار خاقانی کے اشعار کے مقابلہ میں بہت آسان ہیں، اشعار خود بتا رہے ہیں کہ یہ انداز قدما کا نہیں ہے، بعض اندرونی شہادتیں بھی موجود ہیں جن کی بنا پر بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ دیوان حسین بن منصور کا نہیں ہے، اسی دیوان کے صفحہ ۵ پر ایک شعر ہے ؎

خداوندا بجاں آمد دلم از درد بیدادی | شفائے خویش از قانون طلب بو علی سینا

شعر میں بو علی سینا کا نام آیا ہے، شیخ بو علی سینا ۳۷۰ھ میں پیدا ہوئے[1]، حالانکہ حسین بن منصور حلاج ۳۰۹ھ میں اس جہان فانی سے رخصت ہو چکے تھے، اس لیے حلاج کے دیوان میں بو علی سینا کے ذکر کا سوال ہی نہیں ہو سکتا، دیوان میں بعض اشعار ایسے ہیں جن میں منصور کا ذکر ہے لیکن ہر جگہ یہ لفظ بطور واحد غائب استعمال ہوا ہے، واحد متکلم کہیں بھی استعمال نہیں ہوا ہے، مثلاً

منصور ز جانبازی خود شوق نکردے | گر جذب نہانیش ز درگاہ نبودے

مخلصانے کہ نظر ہر چو تو منصور کنند | نے چو اصحاب ہوا کج نظرانند اے دوست

یہ صحیح ہے کہ شعراء اپنے لیے صیغۂ واحد غائب بھی استعمال کرتے ہیں، لیکن ذیل کے شعر میں منصور سے موازنہ ہے

ما بر آنیم کہ مانند تو منصورے نیست | ہمہ ارباب نظر نیز بر آنند اے دوست

اگر یہ شعر منصور کا ہوتا تو موازنہ کا سوال ہی کیا تھا، کیونکہ موازنہ تو اپنے سے الگ شخصیت سے کیا جاتا ہے، یہ شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ دیوان حسین بن منصور حلاج کا نہیں ہے، ایک کا کلام دوسرے کے نام سے منسوب کر دینا کوئی نئی بات نہیں ہے، اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ کسی غیر معروف شاعر کی جگہ کا وہی اسی نام کی دوسری مشہور و معروف شخصیت کے ساتھ منسوب کر دیگئی، خواہ اس نے کبھی ایک شعر بھی نہ کہا ہو، اس دور میں جبکہ تحقیق کا میدان بہت وسیع ہو گیا ہو کسی ملک کے اہل قلم کے لیے اس قسم کی غلطیاں کرنا قابل افسوس ہے۔

---

[1] تاریخ ادبیات ایران مولفہ رضا زادہ شفق ص ۱۳۰

ابن فارس کا تنقیدی نظریہ

(ان کے ایک مخطوطہ کی روشنی میں)

از جناب ڈاکٹر سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے پی ایچ ڈی (علیگ) لکچرر شعبۂ عربی ونکٹیشور یونیورسٹی دکن

ابن فارس کا ایک مخطوطہ "ذم الخطاء فی الشعر" کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں موجود ہے جو اُس اصل مخطوطہ کی نقل ہے جو دار الکتب المصریہ قاہرہ میں محفوظ ہے، یہ چند صفحات کا رسالہ ابتک مستقل طبع نہیں ہوا ہے، مگر غالباً بعض رسائل میں شائع ہو چکا ہے،

ابن فارس کا یہ رسالہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس سے اُس کی ناقدانہ بصیرت اور فکر و نظر کی عظمت کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے، یہ رسالہ شعراء کی غلطیوں کے سلسلہ میں ابن فارس کے خیالات پر مشتمل ہے،

ابن فارس کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ ایک نامور لغوی اور نحوی گذرا ہے، جو نحو میں کوفی المذہب تھا، اس نے قزوین، ہمدان، بغداد اور مکہ میں تحصیل علم کی، اس کی عظمت کے ثبوت کے لیے یہ کافی ہے کہ اس کے شاگردوں میں بدیع الزمان ہمدانی جیسا ادیب تھا، تحریک شعوبیہ کے خلاف اس نے عظیم جد و جہد کی، ۳۹۵ھ میں رے میں وفات پائی، ابن فارس کی تصانیف میں "المجمل فی اللغۃ"، "الصاحبی فی فقہ اللغۃ" اور "سنن العرب فی کلامہا" زیادہ اہم ہیں،

ابن فارس کے نزدیک شعر و ادب کے جو معروف اصول و قواعد ہیں اُن سے شعراء کو

کسی حالت میں بھی مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا، وہ عام عرب ناقدوں اور نحویوں کے اس اصول کے قطعاً مخالف ہیں کہ

انہ یجوز فی الشعر مالا یجوز فی الکلام — شاعری میں وہ جائز ہے جو نثر میں جائز نہیں۔

یہ مقولہ سیبویہ کا ہے، نحویوں نے شعراء کو بہت سی رعایتیں دی ہیں جو خطیبوں اور مصنفوں کو حاصل نہیں، ابن فارس کے نزدیک شعر و ادب میں یہ طرز فکر غلط ہے، اگر شاعر کو یہ حق ہے کہ وہ معروف قاعدہ کے خلاف الفاظ میں تبدیلیاں یا تعلیل کرے تو پھر ادیبوں اور خطیبوں کو بھی یہ حق ملنا چاہیے، اس کی دلیل وہ یہ دیتا ہے:

اگر نحویوں اور ناقدوں کو یہ خیال ہو کہ شعراء "امراء الکلام" ہیں تو خطباء کو امراء الکلام کیوں تصور نہ کیا جائے؟[1] اگر ہم نے شعراء کو امرائے کلام بنایا ہے تو کیا ضروری ہے کہ ان کو معصوم عن الخطاء سمجھ لیں؟

اگر ماہرین زبان یہ دلیل پیش کریں کہ شاعر بحر و وزن اور ردیف و قافیہ کے باعث بعض حالات میں مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ زبان کے معروف قواعد کی خلاف ورزی کرے، ورنہ وزن شعر تام نہ رکھ سکے گا، تو شعر گفتن چہ ضرور؟ کس نے شاعر کو مجبور کیا ہے کہ وہ ایسا شعر کہے جو عروضی غلطی کے ذریعہ موزوں کیا جائے؟

اگر کوئی یہ دلیل پیش کرے کہ شاعر کے ذہن میں ایسے معانی آتے ہیں جو قبیح لفظ کے بغیر شعر کے قالب میں ڈھل نہیں سکتے تو یہ عذر لنگ ہے، شاعر پر کیا آفت آئی ہے کہ جب اس نے بہت سے عمدہ اشعار موزوں کر لیے تو بعض ایسے اشعار بھی کہے جو عیوب پر مشتمل ہوں، فرزدق

---

[1] ابن فارس نے رسالہ میں اعتراضات اور ان کے جوابات اسی طرز سے نقل کیے ہیں، البتہ انھوں نے صیغہ واحد متکلم کا استعمال نہیں کیا ہے۔

کو کس نے مجبور کیا تھا کہ وہ کہے :

لم یدع من المال الا مسحتا او مجلف

(مال نہیں چھوڑا مگر حرام)

یہاں شاعر نے قافیہ کی رعایت سے "مجلفا" کے بجائے "مجلف" کر دیا جس پر نحویوں میں بڑی بحث ہوئی، جب خود فرزدق سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ ہمارا کام شعر کہنا ہے تمھارا کام اس پر جھگڑنا ہے، بقول اکبر ع شعر ہم کہتے ہیں ہجے تم کرو۔ اسی طرح ایک شاعر نے کہدیا کہ :

کانا یوم قُرّی انما نقتل ایانا

(گویا ہم سردی میں اپنے کو قتل کر رہے تھے)

حالانکہ شاعر کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ کسی دوسرے وزن میں ایانا کے بجائے "انفسنا" موزوں کر دیتا، اس طرز کی مثالیں عربی شاعری میں بے شمار ہیں۔

ابن فارس صاف الفاظ میں اعلان کرتے ہیں کہ شعراء بھی عام آدمیوں کی طرح غلطی کرتے ہیں، نحوی اسکا جو جواز پیش کرتے ہیں، وہ ان کے نزدیک محض تکلف ہے۔

اگر نحوی کہیں کہ ممدود کو مقصور بنانا جائز ہے، لیکن مقصور کو ممدود نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ یہ بنا، پر زیادتی ہے، تو انکی اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ ممدود کا قصر بھی صحیح نہیں، اسلیے کہ وہ بنا، میں نقص کا باعث ہے، اس لیے اگر اشعار کہے جائیں تو عمدہ اور عیوب سے پاک ہوں، ورنہ بقول ابن مقفع کے ثقیل اشعار سے انسانی ذوق و روح کو اذیت پہنچتی ہے۔

آثارِ تاریخیہ

تقریر مولانا شبلیؒ

درج ذیل تقریر مولانا شبلی مرحوم نے اس رزولیوشن کی حمایت میں کہ ....

"اس کانفرنس کی رائے یہ ہے کہ بی۔ اے کی ڈگری کے لیے فارسی کا بطور اختیاری مضمون کے قائم رہنا پسندیدہ امر ہے، اور یہ کہ جو نصاب ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مروج ہو اس میں اصلاح و ترقی کی گنجائش ہے" ....

محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس کے تیرہویں سالانہ جلسہ میں فرمائی جو سید امیر علی ایم۔ اے کے زیر صدارت بمقام کلکتہ ۳۰ دسمبر ۱۸۹۹ء منعقد ہوا تھا۔

شیخ محمد اقبال مجددی

حضرات[۱]! پیشتر اس کے کہ میں باضابطہ اس رزولیوشن کی تائید کروں، میں چاہتا ہوں کہ

---

[۱] اس رزولیوشن کی تائید میں شمس العلما، مولوی شبلی صاحب نعمانی نے نہایت مدلل اور پُرمعنی تقریر کی جس کو ہز آنر (سر جان وڈبرن لفٹننٹ گورنر بہادر بنگال) نے نہایت غور سے سنا۔ مولانا کی یہ تقریر بہت لمبی اور نہایت سلیس اور باترتیب تھی، اور واقعات اور دلائل سے بھری ہوئی تھی، تمام حاضرین تعجب کرتے تھے کہ مولانا شبلی کو خدا نے ایسا ملکہ دیا ہے کہ ایسے مشکل مسئلہ پر زبانی تقریر ایسی سلاست اور فصاحت سے کر رہے ہیں کہ تحریر میں بھی اس کا ادا کرنا لوگوں کو مشکل ہے، افسوس ہے کہ ان کی تقریر پوری نہ لکھی گئی نہ باوجود تقاضا کے

(باقی ص ۶۳ پر)

ان دلائل پر جن کی وجہ سے زبان فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی کے تعلیمی کورس سے خارج کی گئی ہے، غور کروں۔ اس قسم کی تجویز کے بانی مسٹر نیسفیلڈ تھے، اور یہ تجویز وقتاً فوقتاً یونیورسٹی سینیٹ میں پیش ہوا کی۔ فارسی کے مخالفین کے دو خاص دلائل ہیں، ایک تو یہ کہ فارسی ایک اختیاری مضمون ہے، جس کو طالب علم بجائے مشرقی کلاسیکل (یعنی عربی یا سنسکرت) کے لے سکتا ہے، جب تک کہ ان زبانوں کے کورس میں تفاوت رہے گا، ہرگز یہ امید نہیں ہو سکتی کہ طلبہ عربی یا سنسکرت کو لیں گے، یا ان زبانوں کے کورس کو فارسی کے آسان کورس پر ترجیح دینگے، اس رزولیوشن کے لائق پیش کنندہ نے متذکرۂ بالا دلیل کا جواب دیا ہے اور رائے دی ہے کہ وہ تفاوت بالکل رفع ہو سکتا ہے، اگر فارسی کورس اتنا ہی مشکل کر دیا جائے جتنا کہ عربی یا سنسکرت کا کورس ہے، اور اس کے پڑھنے اور یاد کرنے میں طالب علم کو اتنی ہی محنت کرنی پڑے جیسی کہ ان دو زبانوں کے کورس میں کرنی پڑتی ہے، یہ بات کہ "فارسی کورس کافی طور پر مشکل کیا جاسکتا ہے" اس کورس سے جو کہ ہم نے حال میں طیار کیا ہے، عملی طور پر ثابت ہوگئی ہے، اور اس میں ناکام طالب علموں کی تعداد اتنی ہی بڑھ گئی ہے جتنی کہ دوسرے مضامین میں ہوتی ہے، یہ بات اس کے مشکل ہونے کی ایک کافی شہادت ہے، دوسری دلیل بڑے غور سے دیکھنے کے لائق ہے۔ فارسی کے مخالفین کہتے ہیں کہ یہ کلاسیکل زبان نہیں ہے، اس لیے قوت متخیلہ کو تربیت دینے کی

(بقیہ حاشیہ ص ۶۲) مولانا موصوف نے لکھ کر بھیجی، ان کی تقریر کے نوٹ جو کچھ لکھ لیے گئے تھے، وہ درج ذیل ہیں مگر انصاف یہ ہے کہ نہ پورا مضمون ان میں ادا ہوا ہے نہ اصلی مضمون کی خوبی اس سے ظاہر ہوتی ہے، اور ہم کو نہایت افسوس اس بات کا ہے کہ ایسی عمدہ تقریریں نہ وقت پر قلمبند ہوئی ہیں، نہ لائق اسپیکر پھر ان کے لکھنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں، بہرحال نیچے لکھے ہوئے بیان سے مولانا شبلی کے خیالات کسی قدر ظاہر ہو سکتے ہیں،

(نواب سید مہدی علی خاں مرتب رپورٹ)

طاقت اس میں نہیں ہے جیسی کہ دیگر زبانوں میں ہے، جو ایسے علم و ادب سے پر ہیں جن میں قوت متخیلہ پوری طرح کام میں لائی جاسکتی ہے، اس کے لٹریچر میں علوم و فنون اور حقیقی شاعری نہیں ہے، لٹریچر دنیا میں اس زبان کے لٹریچر کا رتبہ بالکل ادنیٰ ہے، مسٹر مارٹین کی تقریر کے بعد میرے لیے جو کام باقی رہا ہے وہ یہ ہے کہ میں اس دوسری دلیل کو غلط ثابت کروں، ان تمام باتوں کو کہنے کے لیے جو اس بارے میں کہی جاسکتی ہیں، کم سے کم دو گھنٹے کی ضرورت ہوگی، اس لیے اس مختصر وقت میں جو مجھے ملا ہے، اپنے دلائل کو خلاصتہً بیان کروں گا، میں پہلے علوم و فنون کی جانچ کروں گا، اور اس بات کو دیکھوں گا کہ آیا وہ علوم و فنون جو زبان عربی (جس کے علم اخلاق کی خوبی کے ہمارے مخالفین خود مقر ہیں) میں پائے جاتے ہیں، وہ زبان فارسی میں موجود ہیں یا نہیں، میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علم کی تمام شاخیں جو عربی زبان میں ہیں، فارسی میں بھی موجود ہیں، اگرچہ کتابوں کی تعداد میں زبان فارسی عربی کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی، تفسیر، حدیث، فقہ، معانی و بلاغت کا ایک قابل قدر ذخیرہ زبان فارسی میں ہے، فلسفہ اور منطق میں سے ہر ایک کی ایک ایک مکمل تصنیف موجود ہے، درۃ التاج فلسفہ کی ایک عمدہ کتاب ہے، فارسی زبان میں شفا، ابن سینا کا ایک مفید خلاصہ موجود ہے جس کا علم طب پر حاوی ہونا سب تسلیم کرتے ہیں، ابوریحان بیرونی کی تمام تصنیفات فارسی میں ہیں، جو اسقدر کار آمد ہیں کہ عرب کے علما کو بھی بعض اوقات ان کے حوالے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن زبان فارسی میں علم کی ایک شاخ ایسی ہے جو کہ صرف اسی زبان میں پائی جاتی ہے، وہ مسلمانوں کے مشہور زمانوں کی بیش بہا تاریخ ہے، مجھے علم تاریخ کے فوائد بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یونیورسٹی کی تعلیم میں اس علم کا مفید ہونا ایک مسلّم امر ہے، مشکل سے کوئی مشہور تاریخ عربی زبان میں ایسی ہوگی جو فارسی میں نہ ہو، لیکن چند تاریخی تصنیفات زبان فارسی میں ایسی ہیں جو عربی میں نہیں ہیں، مثلاً شاہنامہ فردوسی، جو فارس کے زمانۂ سلف کی ایک قابل اعتبار تاریخ ہے، اس حیرت انگیز کتاب کے بیچے اور جھوٹے

واقعات کو جدا کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ شاہ ضحاک کے شانوں پر کے خونخوار افعی اور سفید دیو وغیرہ
کے قصے محض کتاب کی زینت کے واسطے ہیں، جو فردوسی کے زمانے کے اشخاص کے پسند خاطر تھے،
لیکن اس کتاب کی اصل تر سچے واقعات کی ہے، جو ان تاریخی معلومات پر جو دیگر ذرائع سے اس
قدیم سلطنت کے بارے میں حاصل ہو سکتے ہیں منطبق ہو جاتے ہیں، اس میں اس زمانے کے شہزادوں
کی طرز تعلیم، ان کے حسب و نسب، ان کی کیفیت مزاج، ان کی حکومت کے حالات وغیرہ تاریخی ہیں،
سر جان ملکم نے جن کو فارس میں عرصہ تک مقیم رہنے کا اتفاق ہوا تھا، اور جنھوں نے بڑی تحقیقات
کے بعد اپنی کتاب تصنیف کی ہے، فی الحقیقت ان معلومات میں جو کہ ہم کو فردوسی کے ذریعہ حاصل ہوئی ہیں
کوئی ضروری اضافہ نہیں کیا ہے، فردوسی کی تصنیف میں باطل مشرقی عقائد کو حذف کرنے کے
بعد ایسے واقعات نہ پائے جائیں گے جو ملکم صاحب کی تاریخ سے مغائرت رکھتے ہوں،
شاہنامہ میں ذکر ہے کہ جب کیکاؤس مازندران گیا تو سحر کے زور سے دن رات میں تبدیل ہو گیا،
ملکم اس واقعہ کے متعلق کہتا ہے کہ دوسری شہادت کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن چندر گرہن تھا ہیرادوٹس
جو یورپ میں ایک مسلم کلاسک ہے، رائج الوقت جانچ کو اس حد تک نہ برداشت کر سکے گا جتنا کہ شاہنامہ جس کے بیانات
غیر حقیقی اور پر از مبالغہ معلوم ہوتے ہیں، علاوہ اس کے مسلمانوں کی تاریخ کے ایسے دور بھی
ہیں جن کے حالات صرف فارسی ہی زبان میں ہیں، خاندان صفاری کے تاریخی حالات جو تیمورلنگ
کا ہمعصر تھا، صرف فارسی میں ہیں، سلطنت مغلیہ کی تمام تاریخیں فارسی میں ہیں، جن کو اگر ہم علیحدہ
کردیں تو ہمارے پاس چھ سو برس کے ملکی اور انتظامی حالات کی واقفیت کا کوئی ذریعہ نہ رہے گا۔
فارسی میں ایک چیز اور بھی ہے جو عربی میں نہیں پائی جاتی، اور جو انگریزی کے قبضہ میں بھی
سو برس پیشتر تک نہ تھی، وہ بادشاہوں اور شہنشاہوں کی اپنی لکھی ہوئی سوانح عمریاں اور
روزنامچے ہیں، میں نے جہانگیر کے عہد حکومت کے حالات کے بارے میں مختلف اشخاص کی

بیسیوں تصنیفات دیکھی ہیں، لیکن کسی میں ایسی سچائی اور حقیقت کے ساتھ واقعات کا ذکر نہیں ہے،
جیسا کہ تزک جہانگیری میں جو اسکی خود تصنیف ہے، اور جسمیں تاریخ کو ناول کے رنگ روپ میں دکھایا گیا ہے، اس طرح سے
یہ ظاہر ہے کہ فارسی میں علوم کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، اب اسکی رنگینی عبارت دکھانا باقی ہے، میں اس وقت
پر فارسی لٹریچر کے حصۂ نثر کو الگ رہنے دوں گا، اور اس کے نظم کے حصوں کی جانچ کروں گا،
کہتے ہیں کہ فارسی نظموں میں وہ آزادی کی روح نہیں ہے جو عربی زبان میں تخصیص حاصل ہے،
یہ سچ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان ایک جنگلی اور خانہ بدوش قوم کے چال چلن کو منعکس کرتی
ہے، جو ریگستان میں آزادی سے زندگی بسر کرتی ہے، اور کسی کے تابع حکومت نہیں ہے، لیکن
فارسی شاعری میں جس کی بنیاد اور ترقی بادشاہوں کے عہد حکومت میں ہوئی قدرتی طور پر ماتحتی
اور چاپلوسی کی روح ہے، اس نقص کے علاوہ فارسی شاعری عربی شاعری کا نہایت عمدگی سے
مقابلہ کر سکتی ہے، اور بعض حالتوں میں اس سے بڑھ سکتی ہے، ہم یورپین علماء کے بہت مشکور
ہیں کہ انھوں نے ہم کو ایک نہایت عمدہ میدان فارسی کی تحقیقات کا بتلا دیا ہے، جو قوت متخیلہ
کو کافی ورزش دے سکتا ہے، وہ فارسی کے علم لسان کا علاقہ سنسکرت اور یورپین زبانوں
کے ساتھ جو آریہ قوم کی زبان سے تعلق رکھتی ہیں دریافت کرنے کا ہے، جرمن پروفیسروں کی اس
مضمون پر بہت سی تصنیفات ہیں، اور جس کا آغاز اس ملک میں سخندان پارس کی تصنیف
سے ہوا ہے، جو کہ ہمارے اردو لٹریچر کے عالی دماغ ہیرو پروفیسر محمد حسین آزاد کی کوششوں کا
ثمرہ ہے۔

اس کے بعد مولوی شبلی نے اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کہ فارسی نظم میں فلسفی
خیالات بھی شامل ہوتے ہیں، کچھ حصے نظم کے پڑھے، اور خاص کر اس بارے میں عمر خیام
کا ذکر کیا، انھوں نے اور حصے نظم کے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ فارسی شعراء نیچر کو کس لطافت

ے بیان کرتے ہیں اور انسانی دل کے جوش کو کس خوبی سے ادا کرتے ہیں، ابھی پڑھے۔

اور فارسی شاعری کی دل سوزی کی مثال میں کچھ اشعار مرثیہ کے پڑھے۔

(مسٹر محمد شفیع اور مسٹر عبد الرحمٰن اور نواب محسن الملک بہادر نے بھی اسکی

تائید کی اور ریزولیوشن بالاتفاق پاس ہوا)

منقول از روئداد محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس، تیرہواں اجلاس

ص ۱۳۶ تا ۱۴۰، بمقام کلکتہ منعقدہ ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۸۹۹ء

مرتبہ نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں بہادر، مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ

۱۹۰۰ء

مقالات شبلی کا سیٹ

۱۔ مقالات شبلی	اول	۳۴۶	صفحے	قیمت معہ
۲۔ " "	دوم	۱۰۶	" "	۶ر
۳۔ " "	سوم	۱۸۰	" "	۲۵ ہے ر
۴۔ " "	چہارم	۱۹۴	" "	۵ ہے ر
۵۔ " "	پنجم	۱۳۶	" "	۶ ۲۵
۶۔ " "	ششم	۲۴۲	" "	صر
۷۔ " "	ہفتم	۱۱۰	" "	۶ر
۸۔ " "	ہشتم	۲۱۴	" "	للعہ
۹۔ خطبات شبلی		۱۶۸	" "	ہے ر

پورے سیٹ کے خریدار کو ۲۰ فیصدی کمیشن دیا جائیگا۔

منیجر

ادبیات

غزل

از جناب پروفیسر افتخار احمد صاحب فخر ایم اے

نسرین و گل میں ہو نہ وہ مشک تتار میں ۔۔۔ خوشبو ہے جو ترے نفسِ مشکبار میں

رنگِ شفق میں ہے نہ کسی لالہ زار میں ۔۔۔ جو کیف ہے تری نگہِ بادہ بار میں

الجھے نہ کوئی ظاہر و نا آشکار میں ۔۔۔ سب کچھ نہاں ہے "ہمتِ یزداں شکار" میں

طوفانِ غم سے لاکھ تھا دل گو فشار میں ۔۔۔ اترا لہو نہ دیدۂ خونناب بار میں

خود اپنے آستانِ محبت پہ بار ہا ۔۔۔ سجدے کیے ہیں عالمِ بے اختیار میں

خوں روئے مجھ پہ کیوں نہ محبت کی بے بسی؟ ۔۔۔ دل اختیار میں ہے نہ وہ اختیار میں

پرواز میں یہی کبھی سدرہ سے ہو بلند ۔۔۔ ظاہر میں یوں تو کچھ نہیں مشتِ غبار میں

کچھ اور بھی ہوا دی تری یاد نے انھیں ۔۔۔ انگارے غم کے تھے جو دلِ بیقرار میں

دوشیزگیٔ نرگس و سنبل کو باغباں! ۔۔۔ گلچیں نے ہائے لوٹ لیا اس بہار میں

صبر و قرار و ہوش نہ منزل تک آسکے ۔۔۔ یہ کاروانِ شوق لٹا رہگذار میں

راس آسکی نہ ہم کو محبت کی زندگی ۔۔۔ امید ہے خجل دلِ امیدوار میں

ہو رسم سجدہ اب، نہ کوئی آستاں ہی ہو

سودا نیا ہے فخرؔ ! سرِ افتخار میں

غزل

ازجناب نیاز کمپنوری

عشق سرمستیٔ شوریدہ سری بھول گیا | یا بشر رازِ عروجِ بشری بھول گیا
شل ہوا دستِ جنوں پردہ دری بھول گیا | دیدہ ورزِ غم وسیع النظری بھول گیا
یہ بھی اعجازِ قفس ہے کہ اسیرِ تازہ | خود بخود صدمۂ بے بال و پری بھول گیا
غم کا بیمار ذرا دیر کی راحت کے لیے | کیف افزائیِ دردِ جگری بھول گیا
خود فریبی کی ہواؤں نے کیا ایسا خراب | گل بھی احسانِ نسیمِ سحری بھول گیا
چھین لی آبِ بیاں دل سے عطائے غم نے | رازداں بنتے ہی افسانہ گری بھول گیا
حسنِ ظاہر کی تجلی میں نظر ڈوب گئی | دیدۂ فکر حقیقت نگری بھول گیا
اپنی آہوں کو عطا کرنا اثر کی طاقت | خود گرفتارِ غمِ بے اثری بھول گیا
اثر صدمۂ فرقت کو نہ اب ڈھونڈ نیاز | صاحبِ غم ہی وہ حیراں نظری بھول گیا

غزل

ازجناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

کیا دن تھے جب مزاجِ جنوں سازگار تھا | خود اپنا تذکرہ بھی مجھے ناگوار تھا
داغِ غمِ بہار سے دل تھا چمن چمن | یادش بخیر جب میں سراپا بہار تھا
تم نے وہ سرخوشیٔ محبت بھی چھین لی | جس پر حیاتِ عشق کا دارومدار تھا
جو تیری یاد تیری محبت میں مٹ گیا | دیوانہ تھا مگر وہ بہت ہوشیار تھا
میرے ہی دم قدم سے تھی آرائشِ چمن | پھر میرے بعد سارا چمن سوگوار تھا
جوہر اک ایسا دور بھی گذرا ہے عشق میں | جب میرا دردِ دل ہی مرا غمگسار تھا

باب التقریظ والانتقاد

غریب الحدیث

ازجناب ڈاکٹر عبدالمعید خاں صاحب، ناظم دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن

موقر رسالہ 'معارف' اکتوبر ۱۹۶۷ء، عدد ۴ جلد ۱۰۰ کے صفحہ ۳۰۵ پر مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی تقریظ دائرۃ المعارف کی مطبوعہ کتاب "غریب الحدیث" پر شائع ہوئی ہے۔

مولانا کی اس قسم کی تعمیری اور نہایت مفید تنقید کو دائرہ بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور دائرۃ المعارف شکر گذار ہے کہ مولانا نے اس کتاب کی اشاعت کو دائرہ کا بڑا اہم کارنامہ اور چند فروگذاشتوں کے باوجود اس کو ایک قابل قدر علمی خدمت تصور فرمایا ہے۔

مولانا کی بتلائی ہوئی فروگذاشتوں کے متعلق چند وضاحت طلب امور کا اس موقر رسالہ میں شائع کر دینا بھی ضروری ہے، تاکہ آیندہ تبصرہ نگاروں کو یہ احساس ہو سکے کہ دائرۃ المعارف کن ناموافق حالات میں برسوں کے علمی کام کو چند مہینوں میں انجام دینے کی کوشش کر رہا ہے،

سب سے پہلے مولانا نے غریب الحدیث کی تصحیح میں جن مخطوطات کو استعمال کیا گیا ہے اُن پر نہایت عمدہ تبصرہ فرمایا ہے لیکن کتب خانہ شیخ الاسلام (مدینہ منورہ) کے مخطوطہ سے جن چند اوراق کا مقابلہ فرمایا ہے اس میں اور دائرہ کے مطبوعہ نسخہ میں بجز اسناد کے کوئی فرق نہیں ہے، البتہ ایک جگہ

مفد وحاً پر مولانا نے "مفد وحاً چاہیے" درج فرمایا ہے، حالانکہ مطبوعہ نسخہ میں مفد وحاً
جو چھپا ہے وہ مدرسہ محمدیہ اور رامپور دونوں نسخوں کے مطابق ہے اور فائق ۲/۲۵۵ سے بھی
اس کی تائید ہوتی ہے، نیز زیر طبع مجمع بحار الانوار جس کی تصحیح خود مولانا نے کی ہے، اس میں
بھی مفرح و مفرح اور مفد وحاً کی روایتیں پائی جاتی ہیں لیکن کہیں مفد وحاً نہیں آیا۔
مدراسی نسخہ کو اصل قرار دینے کی نسبت مولانا کا یہ ارشاد کہ اگر کوئی مجبوری حائل تھی تو
ظاہر کر دیا جاتا کہ ہم غریب الحدیث کی تجرید کو خاص اسباب کی بنا پر اصل قرار دے رہے ہیں"۔
اس سلسلہ میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ خاص سبب مقدمہ (صفحہ ید، یز) میں بیان
کر دیا گیا ہے۔ مدراسی نسخہ کو محذوف الاسانید ہونے کے باوجود اصل قرار دینے کی وجہ تھی
کہ جملہ چار نسخے غریب الحدیث کے مدت مقررہ میں دستیاب ہوئے تھے، ان چاروں میں صرف
مدراسی نسخہ مکمل تھا، اور باقی دیگر نسخے اسانید ہونے کے باوجود ناقص و نامکمل تھے، مدینہ
کے نسخہ کے متعلق شیخ عبد الرحمن الیمانی مرحوم مدیر مکتبۃ الحرم المکی کو لکھا گیا تھا مگر انھوں نے
اس نسخہ کو مہیا نہیں کیا، حکومت ہند اپنے مخصوص پروگرام میں شریک کوئی سات عدد
کتابوں کی تصحیح اور طباعت کے بعد دائرۃ المعارف کو مقررہ عطیہ عطا کرتی ہے؛ چونکہ مقررہ
وقت کے اندر حکومت ہند کے پروگرام کے تحت یہ کتاب بعد تصحیح چھاپنا ضروری تھا، بریں بنا
دیگر مخطوطات کے حاصل ہونے تک انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا، اسی لیے مدراسی نسخہ کو جو مکمل
تھا اصل قرار دیا گیا۔

تاہم کتاب کی تعلیقات میں لیس فی الاصل لکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مصنف کے اصل نسخہ میں
بھی وہ موجود نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ مصنف کے اصل نسخہ میں اختلاف ہو لیکن تعلیقات میں سقط
یا لیس فی الاصل سے مراد صرف وہ اصل ہوتی ہے جس کو مصحح نے اپنی تصحیح کی اساس قرار دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مولانا اعظمی صاحب نے جن فروگذاشتوں کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی ہے
وہ بڑی قابل قدر ہیں، اور اس کتاب کی فہرستیں اور اغلاط نامہ جو زیر طبع ہے ان میں مولانا کی بتلائی ہوئی
غلطیاں (جن میں سے بعض طباعت کی ہیں اور کچھ مصحح کی فروگذاشتیں) پہلے ہی سے موجود ہیں، اور کچھ
مولانا کی رہنمائی سے مزید حاصل ہوئی ہیں، ان کو بھی شریک کر کے فہرستوں کے ساتھ قریب میں شائع
کیا جائے گا، اگر اس کی فہرستیں اور اغلاط نامہ کے شائع ہو جانے کے بعد مولانا کا تبصرہ شائع ہوتا
تو غالباً مولانا کو ان فروگذاشتوں پر روشنی ڈالنے کی اتنی زحمت نہ ہوتی۔

اگر مولانا نے مدینہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام کے نسخہ کو حاصل کر لیا ہے تو مولانا پہلی جلد چھپنے کے
بعد بھی وہ ہم کو مہیا کر سکتے تھے، جلد اول کو مولانا نے دائرہ سے حاصل کر لیا تھا، اب بھی اگر وہ اس کو
مستعار دے دیں تو اغلاط نامہ یا اس کی طبع ثانی میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ مولانا بحیثیت خارجی رکن مجلس علمی دائرۃ المعارف کی کتابوں کی تصحیحات میں
قبل طباعت ہی مصححین کی رہنمائی فرمایا کریں گے جس کی ہم نے مولانا سے بارہا درخواست کی ہے،
اس سے نہ صرف علم کی بڑی خدمت ہوگی بلکہ دائرہ کی افادیت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگا۔

مطبوعات جدیدہ

حجۃ الاسلام - از مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، لمبی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۷۶، مجلد مع گرد پوش قیمت ؎ پتہ: معارف القرآن دار العلوم دیوبند

مجلس معارف القرآن دیوبند کے سلسلۂ مطبوعات کی یہ چوتھی کتاب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہے اور متعدد بار چھپ چکی ہے، اب مجلس نے اس کو بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے، اس میں توحید و رسالت اور اس سلسلہ کے بعض کلامی مباحث، عبادات اور دوسرے اسلامی اصول واہم فروع کو عقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے اور ان کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں، یہ کتاب تقریباً ایک صدی پہلے کی تصنیف ہے، اس لیے اس کا انداز بیان اور طرز استدلال موجودہ دور کے لحاظ سے دقیق و غامض ہے، دار العلوم دیوبند کے ایک استاذ مولانا اشتیاق احمد نے اس کی تشریح و تسہیل کی ہے، مگر شرح میں بھی غیر ضروری طوالت کے علاوہ اکثر غموض پایا جاتا ہے اور اس کو متن کے ساتھ خلط ملط بھی کر دیا گیا ہے، گو یہ کتاب اپنے موضوع پر نہایت جامع و مفید ہے اور اس سے آریوں اور عیسائیوں کے بعض اعتراضات کی تردید بھی ہو جاتی ہے لیکن عام فہم نہیں، اس لیے اس سے صرف خواص ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔

تنویر اللمعان لحامل القرآن - از مولانا مفتی ابو القاسم محمد عتیق فرنگی محلی، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۶۰، قیمت ۳ روپے، پتہ ادارہ اشاعت القرآن والسنۃ ٹکسال، لکھنؤ۔

مولانا محمد عتیق فرنگی محلی بھی اپنے اسلاف کرام کی طرح علوم دینیہ سے خاص شغف رکھتے ہیں اور قرآن مجید اور اس کے متعلقات کی مفید خدمات انجام دیتے رہتے ہیں، زیر تبصرہ کتاب میں جو مصنف کے ترجمہ و تفسیر قرآن کا مقدمہ ہے، قرآن مجید کی تلاوت کے متعلق گوناگوں اور متفرق دینی ہدایات و تعلیمات بیان کی گئی ہیں، یہ مقدمہ سترہ المعات پر مشتمل ہے، ان میں قرآن مجید کے فضائل و برکات و اثرات، اس کی تلاوت و حفظ اور حفاظ قرآن کی عظمت و اہمیت اور تلاوت قرآن کے احکام و آداب، واجبات، مستحبات، مکروہات و مفسدات وغیرہ کی تفصیل تحریر کی گئی ہے، شروع میں قرآن کی عظمت و فضیلت اور تعلیم و تلاوت کی ضرورت و اہمیت سے متعلق چالیس حدیثیں مع ترجمہ و تشریح نقل کی گئی ہیں اور آخر میں قرآن کے اختلاف قرأت کی وضاحت، قرأت کے ائمہ سبعہ کا مختصر تذکرہ اور معلمین قرآن کے آداب و ہدایات درج کیے گئے ہیں، کتاب اپنے موضوع پر بہت جامع ہے، لیکن انداز بیان کہیں کہیں بے ربط ہو گیا ہے، اور روایات کے رد و قبول میں بھی احتیاط نہیں برتی گئی ہے، ہر طرح کی رطب و یابس روایتیں نقل کر دی گئی ہیں، تاہم مجموعی حیثیت سے کتاب بڑی محنت و کاوش کے ساتھ لکھی گئی ہے، اور عام مسلمانوں کے علاوہ طلبہ و علماء کے لیے بھی اس کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔

غبار خاطر - از مولانا ابو الکلام آزاد مرتبہ جناب مالک رام صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۴۰۴ مجلد قیمت ؏
پتہ: ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی۔

ساہتیہ اکیڈمی نے ترجمان القرآن کی دو جلدوں کی اشاعت کے بعد اب مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کے مشہور و مقبول مکاتیب کے مجموعہ غبار خاطر کو بھی نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے،

اس کی ترتیب و تہذیب کا کام اردو کے مشہور اور فاضل اہل قلم مالک رام صاحب نے بڑی محنت و دیدہ ریزی سے انجام دیا ہے، مولانا نے اپنے خطوط میں جو اردو، فارسی اور عربی اشعار، اقوال و آراء اور آیات قرآنی وغیرہ نقل کی ہیں اور جن کتابوں اور مصنفین کا ذکر کیا ہے، فاضل مرتب نے اپنے بیش قیمت حواشی میں ان میں سے اکثر کے حوالے اور ان کے متعلق ضروری معلومات دیدیے ہیں، اور مولانا نے اشعار میں جو تصرف کیا ہے یا اُن سے نقل میں جو مسامحت ہوگئی ہے اس کی اور بعض دوسری فروگذاشتوں کی تصحیح بھی کی ہے، گو خود فاضل مرتب سے بھی بعض مقامات میں سہو قلم ہو گیا ہے، کتاب کے آخر میں ۵ مختلف فہرستیں اور شروع میں ایک فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں مکتوب نگار کے ادب و انشا کی خصوصیات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے اور غبار خاطر کے اسلوب بیان اور طرز ادا وغیرہ کے متعلق اظہار خیال اور مکتوب الیہ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کے خاندانی حالات اور علمی کمالات کا بھی مختصر ذکر کیا گیا ہے، مولانا کے سکریٹری اجمل خاں صاحب کے مقدمہ کو جو پہلے اور دوسرے اڈیشنوں میں شامل تھا، حذف کر دیا گیا ہے، غبار خاطر کا یہ تیسرا اڈیشن صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے نہایت عمدہ اور اعلیٰ ہے۔

بے بات کی بات ۔ مرتبہ جناب نسیم چشتی، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت للعہ/ پتہ: مکتبہ مہر و ماہ، نعمت اللہ روڈ، لکھنؤ۔

یہ ایک خوش مذاق خاتون جناب نسیم چشتی کی ہلکے پھلکے اور دلچسپ فکاہی موضوعات پر ۳۱ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے، اس میں روزمرہ گھریلو زندگی کے واقعات اور بعض دلچسپ کرداروں کا نہایت شوخ انداز میں خاکہ کھینچا گیا ہے، جس سے مصنفہ کے مشاہدہ کی قوت، ذہن کی درّاکی اور مصوری و محاکات میں کمال کا اندازہ ہوتا ہے، ان چند عنوانات سے کتاب کی نوعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، کیا کیا جائے، اگر شوہر کاہل ہو۔ مصیبت میں پھنس گئے۔ زمین خرید کر، آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ نوکر کا مسئلہ۔ وادو غدجی، ناک میں دم ہے۔ مہمان کے مارے۔ لیلیٰ بچشم مجنوں، لیلیٰ بچشم لیلیٰ وغیرہ

زبان نہایت سلیس، شستہ و رفتہ اور انداز بیان شگفتہ ہے، ہر فیچر میں خوشگوار شوخی اور طنز و ظرافت کی لطیف چاشنی بھی پائی جاتی ہے، ان تفریحی مضامین میں بہت سی کام اور تجربہ کی باتیں بھی ہیں۔

میاں افتخار الدین ۔ مرتبہ جناب شورش کاشمیری، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۶۴، مجلد مع گرد پوش، پتہ مطبوعات چٹان لمیٹڈ لاہور۔ قیمت عہ/

آغا شورش کاشمیری مدیر چٹان نے اپنی گذشتہ اسیری کی فرصت میں جو سوانحی خاکے ارتجالاً مرتب کیے تھے، اُن میں یہ کتاب بھی ہے، اس میں انھوں نے پنجاب کے مشہور قومی کارکن اور سیاسی رہنما میاں افتخار الدین مرحوم کی سیرت و شخصیت کے متعلق اپنے مشاہدات و تاثرات قلمبند کیے ہیں، اور اپنے دلکش طرز ادا اور شگفتہ انداز بیان میں میاں صاحب کے رفتار و گفتار، نشست و برخاست، مزاج کی افتاد، طبیعت کے تضاد، سیاسی نشیب و فراز، طرز فکر و طریقہ عمل کی غلطیوں اور بعض اخلاقی عیوب کی اس طرح نقاب کشائی کی ہے کہ میاں صاحب اور ان کے ہم مشربوں (کمیونسٹوں) کی خصوصیات سامنے آجاتی ہیں، مصنف کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی نہایت دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔

وحدت امت ۔ از مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۶۴، قیمت ۸۰ پیسے۔ پتہ: مکتبہ المنبر لائل پور۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اس رسالہ میں بڑے اخلاص و دلسوزی کے ساتھ ملی اتحاد کی اہمیت، تفرق و انتشار کے نقصانات اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے حل کی مناسب تدبیریں بتائی ہیں، اور فروعی اختلافات میں غلو اور جدل و معرکہ آرائی کی افسوسناک تصویر پیش کرکے اس سے بچنے کی دعوت دی ہے، اور صحابۂ کرام و ائمہ مجتہدین کے طرز عمل کی روشنی میں اختلاف رائے اور فساد و جھگڑے کا فرق، اختلاف رائے کی گنجائش، اس کے جائز حدود اور فقہی اختلافات کی صحیح نوعیت کو اجاگر کیا ہے، رسالہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت مفید ہے، امید ہے مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اور ان کے سربراہ ان

مخلصانہ ارشادات پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔

اسلام یا ادیان ۔ از جناب احمد کمال عمر صاحب، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۹۶، قیمت درج نہیں، پتہ احمد کمال عمر صاحب ۱/۴۷۵ فیڈرل بی ایریا، کراچی ۳۸

اس کتابچہ میں دین اسلام کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ قرآن کے نزول سے پہلے بھی اللہ کا دین اسلام ہی تھا، اور حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت عیسیٰؑ تک تمام انبیاء اسی کو پیش کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی دنیا کیلئے یہی ضابطۂ حیات رہے گا، ضمناً قرآن مجید کے سوا تمام الہامی صحیفوں کی تحریف اور قرآن مجید کی حفاظت و اہتمام کا ذکر کیا گیا ہے، آخر میں مسلمانوں کو تمسک بالکتاب کی دعوت دی گئی ہے، لیکن مصنف سے بعض آیتوں کے ترجمہ میں سہو ہو گیا، ان کے بعض خیالات میں بھی ندرت و جدت ہے، مثلاً عربوں کو ام القریٰ کی نسبت سے امی کہا جانا، جو سراسر لغو ہے، دین و شرائع کے فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، اسلئے مصنف کو توراۃ میں اونٹ کے گوشت کی حرمت میں شک اور حضرت مریمؑ کے روزہ میں کلام سے پرہیز کو بحث و جدال سے پرہیز پر محمول کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

اچھے شہری بنو اچھی عادتیں سیکھو برائے جماعت پنجم و ششم شہریت کی ابتدائی تعلیم — مرتبہ مولانا ابراہیم عمادی ندوی جامعی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، قیمت اول و دوم ۸۵ پیسے و سوم ۸۰ پیسے، پتہ عثمانیہ کتب خانہ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۲۹ محمد علی بلڈنگ بمبئی ۳

لائق مولف نے بچوں کو شہریت، تمدن، اجتماع اور اخلاق و مذہب کے متعلق ضروری اور اہم معلومات سے واقف کرانے اور انکی عمدہ اخلاقی تعلیم و تربیت اور بہتر ذہنی و دماغی نشو و نما کے لیے کئی مفید کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے بعض کا اس سے پہلے تعارف کرایا جا چکا ہے، یہ تینوں کتابیں بھی اسی سلسلہ کی ہیں، اور ان میں بچوں کو انکے اسکول، خاندان، گھر، گاؤں اور شہر، انکے صوبوں اور ملک کی حکومت، ہندوستان کے نظام حکومت اور ادارہ اقوام متحدہ تک اور ضروریات زندگی یعنی ہوا، پانی، سورج، غذا، اور حفظان صحت اور مشہور قومی و مذہبی تہواروں اور خدمت کرنے والے پبلک اور سرکاری محکموں، اسکاؤٹنگ وغیرہ کے متعلق گوناگوں قسم کے اہم اور ضروری معلومات، لکھنے پڑھنے، کھانے پینے، ملنے جلنے، نشست و برخاست اور سوسائٹی کے دوسرے آداب اور بعض سائنسی و طبی معلومات اور پیغمبروں، ولیوں اور سادھو سنتوں کے قصے تحریر کیے گئے ہیں، مصنف نے بچوں کی عمر و استعداد کا خیال کر کے انکے مزاج و طبیعت کے موافق عام فہم باتیں لکھی ہیں، انداز بیان دلچسپ ہے لیکن بعض چیزوں کو مکرر سہ کرر لکھا گیا ہے، مولف کا یہ پورا سلسلہ نہایت قابل قدر اور بچوں کے نصاب کے لائق ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۱ ماہ ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۶۸ء عدد ۲

مضامین

مقالات

آثار تاریخیہ

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد